اپریل ۲۰۲۵ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۶ شمارہ : ۴

اپریل ۲۰۲۵ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.in

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان	۳
مقالات	ظہیرالدین ظہیرؔ دہلوی: حیات وفن	ڈاکٹر سید صابر حسن	۴
	۲۰۲۴ء کے خوبصورت افسانوی مجموعے	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۸
	افسانہ: تعریف، فن، تکنیک اور اجزائے ترکیبی	ڈاکٹر مسرت	۱۴
	پھندنے: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر فتح عالم	۲۳
	شوکت حیات: ایک انفرادیدا ماں فنکار	سلطان آزاد	۲۶
	معین الدین دردائی: حیات ونگارشات	ڈاکٹر محمد ثاقب انور	۲۹
	پروفیسر سید حسن عسکری کی اُردو تحریریں	طلحہ نعمت ندوی	۳۶
	شکیلؔ بدایونی کی شاعری: چند نکات	زیبا پروین	۳۹
افسانے	کاش	عظیم اقبال	۴۵
	سڑا ہوا ہاتھ	ڈاکٹر شاہد فروغی	۴۸
ڈرامہ	بیٹا	نثار احمد صدیقی	۵۰
منظومات	مناجات	اقصیٰ نوری	۵۷
	بیٹیاں / خدارا	فردوسؔ گیاوی / منورؔ دانا پوری	۵۸
	غزلیں	مرغوب اثرؔ فاطمی	۵۹
	غزلیں	نذر فاطمی / ڈاکٹر وصی الحق وصیؔ	۶۰
	غزلیں	اوینا ش امنؔ	۶۱
	غزلیں	طلحہ تابش	۶۲
	غزلیں	فصیح احمد ساحرؔ	۶۳
	غزلیں	رہبرؔ گیاوی	۶۴
	غزل	جمالؔ کاکوی	۶۵
کتابوں کی دنیا	سمندر پر ایک اُڑان — اختر واصف	مبصر: ڈاکٹر آصف سلیم	۶۶
	شاہد جمیل: رنگ اور آہنگ — ڈاکٹر اسلام عشرت	مبصر: ڈاکٹر ممتاز فرخ	۶۷
سلام و پیام	ڈاکٹر نشاط، محمد ایان، اختر کاظمی		۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ — ۸۰

''زبان وادب''، میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

شکر مالک کائنات کا ـــــــ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ حاضر ہے۔اس کا مقالاتی آغاز اُس تحریر سے ہو رہا ہے، جس میں ظہیرؔ دہلوی کے سوانحی تذکرے اوران کے اختصاص سخن بحسن تمام یکجا کر دیے گئے ہیں، جب کہ اس کا مقالاتی اختتام اُس تحریر پر ہوا ہے، جس میں شکیلؔ بدایونی کو سوانحی توقیت کے ساتھ یاد کیا گیا اوران کے نظریہ سخن اوران کی شخصیت اورفنی مزاج میں مطابقت دکھاتے ہوئے ان کا شاعرانہ مرتبہ مبرہن کیا گیا ہے۔

مذکورہ دونوں مقالوں کے درمیان، حال کے لئے تازہ معلوماتی اور مستقبل کے لئے نہایت قیمتی دستاویزی تحریر میں ''۲۰۲۴ء کے خوبصورت افسانوی مجموعے'' پرضروری اشارات ونکات کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے اورحسب موضوع بیس کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں پانچ کتابیں خواتین کے دست حنائی کا عطیہ ہیں۔مزید برآں اِس حصہ میں ''افسانہ: تعریف، فن، تکنیک اوراجزائے ترکیبی'' کے عنوان پر بائیس ذیلی سرخیوں کے ساتھ، تدریسی انداز سے نہایت افادیت بخش باتیں ہوئی ہیں اور پھر ''پھندنے: ایک تجزیاتی مطالعہ'' میں منٹو کے اس عنوانیہ افسانے کی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں ''پروفیسر سید حسن عسکری کی اردو تحریریں'' کے عنوان سے مطالعہ کے دوران اُردو میں اشاعت یافتہ ان کے اکتالیس مضامین کی فہرست متعلقہ وضاحت کے ساتھ سامنے لائی گئی ہے اوراگرایک طرف ''شوکت حیات، انفراد بداماں فنکار'' میں اُن کا سوانحی تذکرہ ہوا ہے اورذاتی ملاقاتوں کے حوالے سے انہیں یاد کرتے ہوئے متنی وتنقیدی اقتباسات کے ساتھ ''گنبد کے کبوتر'' پرنظر ڈالی گئی ہے تو دوسری طرف ''معین الدین دردائی: حیات و نگارشات'' میں نہ صرف نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی اُن کی زندگی کے احوال آئینہ ہوئے ہیں اوران کی تصانیف کے بارے میں بتایا گیا ہے، بلکہ ان کی خاکہ نگاری، تذکرہ نویسی اورمختلف النوع مقالہ نگاری کی خصوصی جہتیں بھی اجمالاً دکھائی گئی ہیں۔

''افسانے'' کے تحت تفریحی ماحول اورخوبصورت سیاحتی مناظر سے آراستہ رومانی افسانہ ''کاش'' میں اگراحساس دروں کی آواز بن جانے والا عنوانیہ لفظ اور چونکا دینے والا کلائمکس دیدنی ہے تو افسانہ ''سڑا ہوا ہاتھ'' علاج ومعالجہ کی سہولیات کے لحاظ سے گاؤں کی غربت وپسماندگی ہی نہیں بلکہ ایک معذورانسان کی کیفیت اوربیوی کی محبت کے مناظر بھی صاف صاف دکھاجاتا ہے، جب کہ ڈرامہ ''بیٹا'' میں جوفنی تثلیث بنتی ہے اس کا ایک زاویہ نئی نسل کے حق میں تعلیم کے تعلق سے ایک مزدور باپ کی سوچ، اس کے جذبے، قربانی اورکامرانی کا پتہ دیتا ہے، جب کہ دوسرازاویہ اس باب میں نئے دور کے احوال کا اشارہ دیتے ہوئے پرانی جہاندیدہ نسل کے شکوک وشبہات اورانتباہ سے عبارت ہے اورتیسرازاویہ نئی نسل کے بالکل جذباتی اورانتہائی سفاک ظالمانہ رویے کا وہ منظر دکھاجاتا ہے جس کے نتیجہ میں مقصد ہی سبوتاژ ہو جاتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ جس تعلیم کا بنیادی مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوجائے، وہ تعلیم کیسی کیسی آفتیں لاتی ہے۔ہمیں امید ہے کہ نہ صرف اس شمارے کی مذکورہ نگارشات کے ساتھ اس کے منظوماتی اورتبصراتی حصے پسند آئیں گے بلکہ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی انہیں کسی پہلو سے مایوس نہیں ہونے دے گا۔زیادہ تہنیت عید کے ساتھ خداحافظ، خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابراراحمد خان)

مقالات

ڈاکٹر سید صابر حسن
Hazrat Amir Khusroo Nagar, Near Railway Crossing, Mithanpura,
P.o.- Ramna, Muzaffarpur-842002 (Mob.9801659311)

ظہیرؔ الدین ظہیرؔ دہلوی: حیات وفن

ظہیر الدین دہلوی ۱۸۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جلال الدین حیدر تھے۔ جلال الدین حیدر کو خط نسخ میں کامل عبور اور اس فن میں بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف حاصل تھا۔ ظہیرؔ الدین دہلوی کی ابتدائی تعلیم عربی وفارسی کی اوائل عمری میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ مکتب کی تعلیم کے دوران ملکہ شاعری بیدار ہوا اور فن شاعری میں انہیں رفتہ رفتہ کمال حاصل ہوا۔ شاہ نصیرؔ کی صحبت میں شعر کہنا شروع کیا۔

ظہیرؔ دہلوی والد کی کوشش سے بہادر شاہ ظفرؔ کے داروغہ ماہی مراتب ہوئے۔ ذوقؔ اور غالبؔ کی شاگردی کا بھی انہیں شرف حاصل تھا، لیکن وہ مومنؔ کے شاعرانہ کمال سے زیادہ متاثر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ان کی شخصیت کو بہت متاثر کیا تھا۔ ظہیر الدین ظہیرؔ دہلوی نے اپنی شعر گوئی سے متعلق لکھا ہے کہ:

> ’’اول غزل میں نے مشاعرے میں پڑھی تھی اور جناب شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ خاقانی ہند کا شاگرد ہوا۔ میرا سن کم و بیش اس زمانہ میں چودہ سال ہوگا۔ استاد نے غزلیں دیکھ کر فرمایا کہ انشاءاللہ تو شاعر ہوگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مشاہیر شعرا سے آسمان دہلی جگمگا رہا تھا۔ غدر نے ابھی پوری طرح اس تہذیب و معاشرہ کی کمر نہیں توڑی تھی۔ ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، آزردہؔ، صہبائیؔ، شیفتہؔ وغیرہ سے بزم سخن روشن تھی۔ بے شمار ہونہار شعرا مثلاً مرزا داغؔ دہلوی، میر مہدی مجروحؔ سب مشاعروں کی رونق بڑھا رہے تھے۔ زمانۂ غدر تک یہ گلزار سخن شاداب وسیراب تھا اور یہ خوش نوایانِ چمن ایک جا فراہم ہو کر نواسنجیاں کرتے تھے۔ فقیر بھی اس بوستان تاراج شدہ کا ایک نخل خزاں رسیدہ ہے۔ زمانہ غدر کے بعد اس مرقع کا شیرازۂ جمعیت درہم برہم ہو کر ورق ورق منتشر ہو گیا۔‘‘

(داستان غدر، ظہیر دہلوی کریمی پریس لاہور ۱۹۱۴ء)

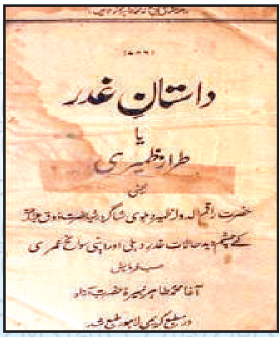

۱۸۵۷ء کے غدر میں دہلی بڑی تباہی و بربادی سے دوچار ہوئی۔ ظہیرؔ بھی اس کی زد میں آگئے۔ انگریزوں نے سب کچھ لوٹ لیا۔ اس مصیبت ناگہانی سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے شہر کو چھوڑا اور رام پور میں سکونت پزیر ہوئے، مگر ان کا یہ قیام بھی عارضی تھا۔ وہ مختلف جگہوں کی سیر کرتے رہے۔ دہلی بھی دوسری بار جانا ہوا، پھر حیدرآباد کا رخ کیا، پھر ان کو ٹونک کا دعوت نامہ ملا۔ انہوں نے ٹونک کے لئے اپنا سامان سفر باندھا اور وہاں جا کر بوش و باش اختیار کی۔ ان کی تخلیقی کاوشیں یہاں بارآور ہوئیں۔ راجا بھگوان داس اور خواجہ عبدالرحیم خان صاحب کی سرپرستی میں ان کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ اُس زمانہ میں ان کی شاعری بام عروج پر پہنچی اور اسے بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ انہوں نے اپنی داخلی اور خارجی پریشانیوں کا تذکرہ اپنی خودنوشت سوانح حیات موسوم ’’داستان غدر‘‘ میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

ظہیرؔ خستہ و آفت رسیدہ بس غنیمت ہے
چراغِ صبح گاہی ہے کسی بزم سخن داں کا

ظہیؔر دہلوی چودہ سال کی عمر میں کلام موزوں کرنے لگے تھے۔اس زمانہ میں آسمانِ شاعری پر تین درخشاں ستارے ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ جلوہ افروز تھے۔ ظہیؔر ان تینوں شعرائے کرام کے کلام سے متاثر ہوئے، مگر سب سے زیادہ ان کی شاعری پر مومن خاں مومنؔ کی شاعری کا رنگ غالب آیا۔ ظہیؔر نے ''داستان غدر'' میں لکھا ہے کہ:

''زمانہ غدر کے پانچ چار سال کے بعد جب دہلی واپس آیا اور چرچا شعروسخن کا رہنے لگا تو مفتی صدرالدین آرزؔدہ ونواب مصطفیٰ خاں شیفتؔہ اور حافظ غلام رسول صاحب کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا، مگر اصلاحِ سخن کسی سے نہیں لی، لیکن ان بزرگواروں اور دیگر کاملین کے کلام دیکھ کر بہ نظرِ غور استفاضہ حاصل کیا اور اپنی طبیعت کے زور سے ان تینوں استادانِ وقت ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، کے کلام کا لب ولباب اخذ کر کے اپنی طرز جداگانہ اختیار کی۔ شیخ صاحب مرحوم (ذوقؔ) کی تو زبان ومحاورات کی پیروی اختیار کی۔ مومنؔ صاحب کے مضامین اور نازک خیالی وسوز گداز کا اتباع کیا۔ مرزا غالبؔ صاحب کی بندش وترکیبات کی تقلید اختیار کی۔''

(داستان غدر،ص۔۲۵۰ وص ۲۵۱)

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہی خاص وجہ تھی جس کے سبب ظہیؔر دہلوی کی شاعری کا وزن وقار بلند ہوا اور وہ اپنے معاصرین کی صف میں اپنا ایک اہم مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی شاعری میں خصوصی طور پر مومنؔ کے کلام کے جلوے محسوس کئے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی شاعری ناسؔخ وغالبؔ کے شاعرانہ اثرات سے بھی خالی نہیں۔اس سلسلے میں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

بڑھے دست دعا جتنا یہ کافر دور کھنچتا ہے
فلک بھی گوشہ ہے تمہارے دورِ داماں کا

رندانِ بادہ کش کو بلانا ضرور تھا
واعظ اگر بیان شرابِ طہور تھا

آئینہ دیکھتے ہی تحیر میں آگئے
اتنی سی کائنات پر اتنا غیور تھا

عشق کیا شے ہے، حسن ہے کیا چیز
کچھ ادھر کی ہے کچھ اُدھر کی آگ

کہیں ناسؔخ کا انداز بیاں اور کہیں غالبؔ ومومنؔ کی تصویر کشی کے اثرات بھی ظہیؔر اپنی شاعری میں قبول کرتے ہیں۔

مری وحشت میں شوخی ہے مزاج لااُبالی کی
مری خاطر میں عالم ہے تری زلف پریشاں کا
مرے ماتم کدہ میں نور وظلمت سب برابر ہیں
سویدائے شب غم ہے سپیدہ صبح ہجراں کا

ظہیؔر کی شاعری میں دبستان دہلی اور لکھنؤ کی بھر پور رنگ آمیزی ملتی ہے اور جدید رنگ بھی جھلکتا ہے۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''گھر کے کتب خانہ کو دیکھا تو اہل فارس کے دواوین بکثرت نظر آئے۔ ان کو دیکھنا شروع کیا۔ دیوان ناسؔخ و آتؔش اور واسوخت اور مثنویاں وغیرہ لکھنؤ سے چھپ کر تازہ تازہ دلی میں آگئی تھیں۔ شبانہ روز ان کے دیکھنے کا مشغلہ رہنے لگا۔'' (داستان غدر)

عشق مجازی کا نہایت چوکھا رنگ ظہیؔر دہلوی کی شاعری میں محسوس کیا سکتا ہے۔اس ضمن میں وہ مومن خاں مومنؔ سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار میں سوز وگداز، نازک خیال اور شوخ کلامی کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں جو ان کے تخلیقی جوہر میں حسن ونکھار پیدا کرتے ہیں۔ چند اشعار اس سلسلے میں قابل توجہ ہیں۔

اعجازِ دلفریبیٔ انداز دیکھنا
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا
قاصد بھی کوئی صبر دل نا شکیب تھا
آتے ہی آتے راہ میں کم بخت مر رہا

ہیں تو کیا ہیں اپنے پیراہن میں ہم
کیا سمائیں دیدۂ دشمن میں ہم

نعش دشمن پر وہ آئے اشک بار
نغمہ آمیزی کریں شیون میں ہم
کیا بتائیں طرز مومنؔ اے ظہیرؔ
طاق ہیں لا ریب اپنے فن میں ہم

تم تھے جہاں جہاں وہیں دل بھی ضرور تھا
میں بد گمانیوں سے بہت دور دور تھا

گیسوئے عنبریں ہے صبا اور صبا سے ہم
مہکی ہوئی ہے آج ہوا اور ہوا سے ہم
شوخی سے ایک جا تجھے دم بھر نہیں قرار
بے چین تجھ سے تیری ادا اور ادا سے ہم

پردہ اُٹھے کہ نہ اُٹھے، مگر اے پردہ نشیں
آج ہم رسم تکلف کو اُٹھا دیتے ہیں

ظہیرالدین ظہیرؔ دہلوی کی شاعری پر مولانا حسرتؔ موہانی اپنی قیمتی رائے یوں سپرد قلم کرتے ہیں:

''ظہیرؔ ذوقؔ کے شاگرد ہیں، لیکن ان کے کلام میں ذوقؔ کے بجائے مومنؔ خاں کا رنگ زیادہ تر غالب نظر آتا ہے۔ خیال کی نزاکت، ترکیب فارسی کی خوبی اور اسلوب بیان کی جدت سے ان کی اکثر غزلیں اس درجہ مالا مال ہیں کہ ان میں اور مومنؔ خاں کے کلام میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے جب کبھی ان صفات پر رنگینیٔ الفاظ اور نوی ترکیب کی خوبیاں بھی زیادہ ہو جاتی ہیں تو حضرت ظہیرؔ کی غزلوں میں دل پزیری کی وہ شان پیدا ہو جاتی ہے جس کی مثال مرزا نسیمؔ کے سوا اور کسی شاعر کے کلام میں راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری۔''

(تذکرہ شعرا، حسرتؔ موہانی، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۹ء، ص۳۱۲ و ص۳۱۳)

ظہیرؔ کے یہاں مومنؔ کا رنگ تغزل دیکھیے۔

بزم دشمن میں مجھے زیر نظر کیوں رکھا
کوئی ارماں نہ تھا میں کہ نکلنے نہ دیا
زور تم پر نہ چلا کچھ تو تمہارے بدلے
ہم نے گھر سے شب ہجراں کو نکلنے نہ دیا

فتنہ گر شوخی حیا کب تک
دیکھنا اور نہ دیکھنا کب تک

منھ چھپانا نہ پڑے دشمن سے
اے شب غم سحر نہ ہو جائے

الجھ کر تو نے دست شوق کیوں گستاخ دستی کی
وہ کافر اور ہی رہنے لگا ہوشیار دامن سے

ظہیرؔ کی غزلیں جذبہ عشق سے سرشار ہیں، مگر عریانیت وفحاشی سے بالکل پاک ہیں۔ جنسی تلذذ و بے راہ روی کا کہیں نام ونشاں نہیں، اس لئے قاری کا ذہن انتشار کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ان کے اشعار راحت وسکون اور قلب وجگر کے لئے مسرت فراواں کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ جنسی جذبے کی آسودگی میں شائستگی برقرار رہتی ہے، مگر شوخ کلامی بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

خدا جب مہرباں ہوگا تو تم بھی مہرباں ہوگے
کہ بے حکم خدا کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

ہم ترے کوچے سے یوں آئے ہیں گرتے پڑتے
جس طرح گھر سے اٹھائے کوئی بیمار قدم

نہ بیٹھے ہیں نچلے نہ بیٹھیں گے دشمن
یہ موذی تمہارے ابھارے ہوئے ہیں

پیامی سے کہتے ہیں کس نے کہا تھا
وہ رات بھر یوں تڑپتے رہے ہیں

الٰہی خیر ہو بے طرح وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
نگاہیں کہہ رہی ہیں منتظر دشمن کے بیٹھے ہیں

ظہیرؔ دہلوی نے اپنا جداگانہ طرز خاص بھی ایجاد کیا۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں بڑی شعریت ہے اور معنی ومفہوم کا دریا رواں ہے اور سادگی و

صفائی بھی یکساں ساتھ دیتی ہے ۔

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

چاہت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہو بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

کوئی پوچھے تو سہی ہم سے ہماری روداد
ہم تو خود شوق میں افسانہ بنے بیٹھے ہیں

بہت معمورۂ ہستی میں اجڑے گھر نکلتے ہیں
جہاں کھودو وہیں بنیاد کے پتھر نکلتے ہیں

ظہیرؔ دہلوی نے مرثیہ نگاری میں بھی اپنی جدت فکر و جودت طبع کا خوب ثبوت دیا ہے اور یہاں بھی فصاحت و بلاغت کا دریا رواں ہے۔ ان کی مرثیہ گوئی پر میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کے مرثیوں کے اثرات ہیں اور انہوں نے اپنے علمی تبحر کا بھی ثبوت دیا ہے ۔

گل گونۂ شفق جو ہوا رہ نمائے صبح
نوشاہِ روزگار نے پہنی قبائے صبح
گردونِ لاجورد پہ پھیلی ضیائے صبح
تاباں ہوئی تجلی نورِ لقائے صبح
ہر شخص محو صنعت ربّ فلق ہوا
والشّمس والضحٰی کا جہاں میں سبق ہوا

وہ سایہ اور وہ نور سہانا سا جا بجا
وہ شورِ کوسِ صبح وہ صحرائے کربلا
وہ نالہ طیور اذانوں کی وہ صدا
وہ صورت نغمہ سنجی مرغانِ نے نوا
اُڑتی سی وہ دھنک کی جھلک سبزہ زار پر
گل کاریاں تھیں تختہ مینو نگار پر

میر انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں میں جو شدت ہے اور اس سے رنج و غم کی جو گہری کیفیت قارئین کے دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے، وہ کیفیت ظہیرؔ دہلوی کے یہاں نہیں پائی جاتی وہ اپنے بیان سے گہرے غم کی فضا ضرور قائم کر دیتے ہیں، مگر قارئین پر دلدوز کیفیت طاری نہیں کرتے، البتہ اس میں شک نہیں کہ انہیں زبان و بیان پر بڑی قدرت ہے اور ان کے مرثیوں سے ان کی شاعرانہ عظمت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نور الحسن ہاشمی ظہیرؔ دہلوی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ظہیر دہلوی متوفی ۱۹۱۱ء اس عہد کے ایک نامور شاعر تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفرؔ کے داروغہ ماہی مراتب تھے، لیکن شاعری کا ذوق فطری تھا۔ پہلے ذوقؔ کے اور پھر غالبؔ کے شاگرد ہوئے، لیکن وہ مومنؔ سے زیادہ متاثر تھے۔ ان کی زندگی انقلاب زمانہ کا مرقع تھی۔''

(دلی کا دبستان شاعری، ص ۲۶)

❁❁❁

ضروری ھی ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان و ادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔ آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ از راہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

پروفیسر اسلم جمشید پوری
HOD, Urdu, CCS University,Meerut - 250001 (Mob.09456259850)

۲۰۲۴ء کے خوبصورت افسانوی مجموعے

اس بار (۲۰۲۴ء میں) کئی اہم افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ’’جب تک ہے زمیں‘‘ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے محقق اور ناقد ہیں اور وہ ’’مابعد جدید نو آبادیاتی مطالعے‘‘ کے بنیاد گزار۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی قابل فخر انعامات مل چکے ہیں۔ ایسے بہت ہی کم لوگ ہیں جو تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ فکشن اور فکشن تنقید بھی لکھتے ہوں۔ وزیر آغا اور انور سدید کے بعد ناصر عباس نے تحقیق و تنقید کا علم بلند رکھا ہے۔ مغرب کی نئی تھیوریز ہو یا مشکل اصطلاح، ناصر عباس نے اپنے مطالعے اور رویے سے اسے آسان بنا دیا ہے۔

ناصر عباس نیر نے لیک سے ہٹ کر افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اور معاشرے میں روز بہ روز آنے والا تغیر افسانوی رنگ میں ملتا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں ۱۶ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض افسانے سماج کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اپنے ملک کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ادبی صورتِ حال کا بہت اچھا بیان ہیں۔ کچھ افسانے مثلاً ’’گڑ اور گولیاں‘‘، ’’چائے کا ایک کپ‘‘ اور ’’چمڑے کا ایک پاؤچ‘‘، ’’نطشے اور مریل گھوڑا‘‘، ’’پہلے کھیل اور بعد میں لکھی گئی تمثیل‘‘، ’’اپنے ماضی کے خدا‘‘ تو آج کے افسانے کی روایت میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔

’’زندگی کا بازار‘‘ لے کر کشمیر سے ڈاکٹر ریاض توحیدی آئے ہیں۔ یہ ایک ایسا بازار ہے جو بڑا عجیب و غریب ہے۔ ویسے تو یہ ریاض توحیدی صاحب کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس پر مرتب کی حیثیت سے انور مرزا کا نام ہے، جب کہ اندر ان کا ایک حرف بھی (مقدمہ وغیرہ) نہیں ہے۔

اس مجموعے کے نام کے نیچے ’’مابعد جدید افسانوں کا انتخاب‘‘ لکھا ہوا ہے۔ اس جملے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ریاض توحیدی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ نہیں، بلکہ ان کے تمام افسانوں کا انتخاب ہے۔ اس میں ان کے کئی پرانے افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے اپنے عصر کی آواز ہیں، خاص کر کشمیریوں کی زندگی، ان کے سیاسی اور سماجی مسائل و معاملات، دہشت گردی اور خوف و ڈر کی کہانی موجود ہے۔ ریاض توحیدی کے معروف افسانوں میں ’’جشن قبرستان‘‘، ’’کالی دھند اور سفید کبوتر‘‘، ’’جنت کی چابی‘‘، ’’دردِ کشمیر‘‘، ’’ناقوس و اذان‘‘، ’’زندگی کا بازار‘‘، ’’سنگ باز‘‘، ’’ہوم لینڈ‘‘، ’’گلوبل جھوٹ‘‘، ’’ہائی جیک‘‘، ’’کبوتر اور سانپ‘‘، ’’کشمیر نواز‘‘ وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے اس مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ’’زندگی کا بازار‘‘ ہے۔ جس میں ایک پھیری والے کا کردار ہے، جسے لڑکوں بچوں، سب سے بڑا پیار ہے۔ وہ اپنی گٹھری میں طرح طرح کی چیزیں رکھتا ہے۔ کوئی بچہ اگر بغیر پیسے کے بھی کچھ لے لیتا تو وہ کچھ نہیں بولتا۔ وہ ایسی جگہ رہتا تھا جہاں ہر چیز خالص ملتی، جہاں کی آب و ہوا بھی نہایت صاف ستھری تھی، جب کہ کشمیر کے بہت سے علاقوں میں ملاوٹ عام تھی، کوئی بھی چیز خالص نہیں تھی۔ یہاں زندگی کا ہر آرام اور آسائش موجود تھی، کیا اے سی، کمپیوٹرس، موبائل، انٹرنیٹ، بڑے بڑے محلات، قیمتی گاڑیاں، اولڈ ایج ہاؤس سب کچھ موجود تھا، لیکن سکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا ایک جملہ تو مصنف کو بہت پریشان کرتا تھا:

’’زندگی کی سب دکانیں بند ہیں اس شہر میں۔‘‘

دراصل اس افسانے میں قدیم اور جدید زندگی اور ماحول کا تقابل کیا گیا ہے جس کے لئے مصنف نے پھیری والے کو واسطہ بنایا ہے، جس کی زندگی میں بظاہر کوئی آرام نہیں، مگر اس کے پاس ہر چیز میں شفافیت ہے۔ اس کی زندگی میں سکون ہے جب کہ جدید عہد میں ہر طرح کی سہولتیں ہونے کے

باوجود سکون نام کو نہیں ہے اور یہ کسی دکان یا بازار میں نہیں ملتا۔

ایم اے کنول جعفری کا تازہ افسانوی مجموعہ ''زخمی روح'' ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ کنول جعفری ایک بامقصد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تحریر میں سماج کے لئے ایک پیغام ملتا ہے۔ ان کا نظریہ اصلاح پسند ہے۔ وہ موجودہ سماج کی سرگرمیوں سے پریشان ضرور ہیں، لیکن مایوس نہیں۔ آج جو ہر طرف نفرت کا زہر پھیلا ہوا ہے، جس نے انسانیت کو خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ سماج کی یہ تقسیم امیر اور غریب کی سطح پر نہیں ہے بلکہ یہ مذہب کی بنیاد پر ہے جو روز بہ روز سماج اور معاشرے کو اندر اندر کھوکھلا کر رہی ہے۔

ایم اے کنول جعفری کے اب تک دو افسانوی مجموعے ''چاک کا بوسیدہ ٹکڑا'' اور ''خاموش لب'' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری مقصدی ہے وہ افسانہ نگاری سے صحت مند معاشرے کی تعمیر کرنا اور سماج میں اسلام کی قدریں عام کرنا چاہتے ہیں، اس لئے ان کے ہر افسانے میں اچھی اچھی باتوں کی تلقین ہوتی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے معروف افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر عبید اللہ چودھری رقم طراز ہیں:

> ''ایم اے کنول جعفری اپنی بعض کہانیوں کے ذریعہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسداری کرنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے انہیں قدروں کو اپنی زندگی میں برتا ہوگا۔''

ایم اے کنول جعفری کے کئی افسانے خاصے مقبول اور اہم ہیں۔ مثلاً ''چاک کا بوسیدہ ٹکڑا''، ''خاموش لب''، ''ایثار''، ''دھندے سے جڑے لوگ''، ''زخمی روح''، ''شریف لوگ''، ''پتھر کے آنسو''، ''گنٹو رکھشک''، ''پر بھوداسی''، ''حویلی کی چڑیا''، ''پیٹھ پر سوتیلا بوجھ'' وغیرہ۔ ''زخمی روح'' میں انہوں نے نوٹ بندی کے وقت گاؤں دیہات کے سیدھے سادے لوگوں کو درپیش مسائل رام دیال کے اعلیٰ کردار کے توسط سے پیش کیا ہے، جس نے اپنی زندگی میں دوسرے کسانوں کی ہر ممکن مدد کی۔ ایک ہائی وے جام اور بھگدڑ میں رام دیال کی موت ہو جاتی ہے۔ بیٹوں کی محبت، پولس کی بے حسی اور فضل الرحمٰن کی دوستی کو یہاں نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے، مگر افسانے کا اختتام مقصدیت کی نذر ہو گیا ہے۔

''روشنی کی نئی کرن'' شمشاد جلیل شاد کے افسانے اور افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ شمشاد جلیل شاد کا انتقال کووڈ کے پہلے دور میں ۹/اپریل ۲۰۲۱ میں ہوا۔ وہ سہ ماہی ''اسباق'' کی نائب مدیرہ تھیں۔ اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ ان کی موت کے بعد ڈاکٹر ترنم نے اِدھر اُدھر پڑے ان کے افسانوں اور افسانچوں کو جمع کیا اور انہیں کتابی شکل میں مرتب کیا۔

شمشاد جلیل شاد کی اس سے قبل کئی کتابیں ''پہلی دھوپ کا سایہ''، ''پونے میں اردو صحافت''، ''نعتیہ ماہیے''، ''رحمت عالم''، ''نذیر فتح پوری کے روبرو''، ''نذیر فتح پوری شہر سخن کا مسافر''، ''کیسر کی مہک'' (ہندی میں) شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کے اور ڈاکٹر ترنم کے تعلق سے ڈاکٹر نذیر فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''شاد صاحبہ ایک مخلص خاتون تھیں۔ خود کو پیچھے رکھ کر دوسروں کو آگے بڑھانے کا ان کا جذبہ قابل ستائش تھا۔ آج کے زمانے میں ایثار کا ایسا جذبہ کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر ترنم سے ان کا ادبی رشتہ تو تھا ہی، دونوں شخصی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب تھیں۔''

(روشنی کی نئی کرن، اسباق پبلی کیشنز، پونے، ص ۵)

شمشاد جلیل شاد کا اہم افسانہ ''روشنی کی کرن'' ہے۔ یہ کتاب کا ٹائٹل افسانہ ہے۔ اس افسانے میں اپنوں کی غیریت اور غیروں کی اپنائیت دکھائی گئی ہے کہ کس طرح اپنے بچے باہر ملک چلے جاتے ہیں اور ان کی نظر صرف جائیداد پر ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ ماں کے ارمانوں کے گھر کو فروخت کر دیتے ہیں اور ان کی نوکرانی کی بیٹی انہیں اپنے گھر میں، محبت سے رکھتی ہے۔ یہ ان کا بڑا جذباتی افسانہ ہے۔

تاج الدین محمد کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خدا کے گھر کا بٹوارا'' ابھی شائع ہوا ہے۔ اس میں تقریباً ۲۵ افسانے شامل ہیں جو افسانہ نگار کے فن اور خیال وفکر کو پیش کرتے ہیں۔ تخلیق کار کے اندر معاشرے کے مثبت اقدار کی طرف جھکاؤ زیادہ ہے۔ اسے اسلام کی باتوں سے بھی جو اخلاق وکردار کو بہتر بناتی ہیں، خاصا لگاؤ ہے۔ قرآن اور نماز سمجھ کر پڑھنے پر ان کی توجہ زیادہ ہے۔ یہ تمام باتیں ان کے افسانوں میں کہیں

بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ در آئی ہیں۔ ان کے اچھے افسانوں میں ''پنچر والا''، ''خدا کے گھر کا بٹوارہ''، ''اپاہج''، ''نصیبوں جلی''، ''بازگشت''، ''موت کے سوداگر''، ''رحم دل بوڑھا''، ''سو روپے کا نوٹ'' کا شمار ہونا چاہیے۔

ان کا افسانہ ''خدا کے گھر کا بٹوارہ'' ٹائیٹل افسانہ ہے۔ اس میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کے اندر کی تفریق کو پیش کریں۔ مسجدوں کی تقسیم ان کے دل پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ دیو بندی مسجد اور بریلوی مسجد، افسانہ نگار کا دل اس تفریق کے لئے کڑھتا ہے۔ وہ قریب کی ہی مسجد میں نماز ادا کر لیتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ سب مولویوں نے کیا ہے۔ افسانہ تو ختم ہو جاتا ہے، مگر جہاں عام قاریوں کے لئے سوال چھوڑ جاتا ہے، وہاں ناقدین کے دل میں بھی سوال اٹھتا ہے کہ یہ کیا افسانہ ہوا؟ اس میں تحیر و تجسس کہاں ہے؟ کلائمکس کیا ہے؟

نشاط پروین کا پہلا افسانوی مجموعہ ''رانگ نمبر'' تازہ تازہ وارد ہوا ہے۔ اس میں ان کے بتیس افسانے شامل ہیں۔ ان میں کوئی بڑا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ کسی بڑی بحث کا آغاز نہیں کرتے، مگر یہ نشاط پروین کے افسانے ہیں، یہ ہمیں چونکاتے ہیں، غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں بہت سے واقعات، کردار اور مناظر جانے پہچانے لگتے ہیں۔ یہ سب ہمارے سماج کا ہی حصہ ہیں۔ ان میں عام انسانوں کا درد ہے، کرب ہے، جذبات ہیں تو ان کی خوشیاں اور غم بھی ہیں، جو افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

افسانہ ''رانگ نمبر'' بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے اپنوں کے رنگ بدلنے کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ایک بیٹا جو پڑھنے کے لئے باہر جاتا ہے۔ پڑھائی کے بعد وہیں شادی کر لیتا ہے۔ گھر سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ عرصہ بعد پوتی کا فون آتا ہے اور وہ دادا دادی کو دہلی اپنے گھر بلاتی ہے۔ بیٹے سے بھی بات ہوتی ہے۔ وہ لوگ بیٹے اور پوتی کی محبت میں دہلی کا سفر کرتے ہیں۔ اسٹیشن پر بیٹے کو ریسیو کرنا تھا۔ وہ ٹریفک میں پھنسنے کا کہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی گھنٹوں انتظار کرتے رہتے ہیں۔ وہاں عورت کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ بہو کو فون کرنے پر ''رانگ نمبر'' ہونے کی اطلاع ملتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر انہیں واپسی کی ٹرین میں بٹھا دیتا ہے۔ ٹرین چل پڑتی ہے تو بیٹے کا فون آتا ہے۔ ''رانگ نمبر'' کہہ کر باپ فون کاٹ دیتا ہے۔ یہ بھی بڑا ہی جذباتی قسم کا افسانہ ہے۔

''انتظار اب دریچوں سے نہیں جھانکتا'' سیدہ ایمن کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مذہبی رنگ بڑا واضح ہے۔ یہ سبھی افسانے اخلاقی درس کے حامل ہیں۔ سیدہ ایمن کا مقصد معاشرے میں مثبت قدروں کو عام کرنا ہے۔ مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ''انتظار.....'' ہے جو ایک مشہور اسپتال کی کہانی ہے۔ اسپتال والوں نے دس سال کے بچے کو کینسر ہونے کا اعلان کر دیا، جسے بچے کے گھر والے، خاص کر اس کے والد بالکل ماننے کو تیار نہیں اور شور شرابہ کرتے ہیں۔ کہیں اور ٹیسٹ کرانے کی بات کرتے ہیں۔ اسپتال کی مالک ڈاکٹر نشاط بچے کے والد کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ موت کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ وہ کسی بھی عمر میں آسکتی ہے۔ بس یہی افسانے کا حاصل ہے۔

نجم باگ کے دو دو افسانوی مجموعے ''وفور'' اور ''مکافات'' ایک ساتھ ۲۰۲۴ء میں شائع ہوئے ہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی افسانہ نگار کے دو مجموعے ایک ساتھ شائع ہوئے ہوں۔ نجم باگ کا تعلق گلبرگہ سے ہے۔ نجم باگ بہت زمانے سے افسانے لکھ رہے ہیں، لیکن یہ افسانے اب مجموعے کی شکل میں آئے ہیں، اسی لئے ان کا رنگ بھی جدیدیت والا ہے۔ ان میں بہت سی سطریں منظوم ہیں۔ یہ افسانے کے مکالمے ہیں۔ ان سے افسانے کی تاثیر میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں ان سے افسانوں کے لب و لہجہ اور اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔

نجم باگ کے دونوں مجموعے میں ۱۹، ۱۹ افسانے ہیں اور یہاں ۷۵ فی صد افسانوں میں نظمیہ طریقہ اپنایا گیا ہے۔ کئی افسانے تو نظم ہی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے جدت ہو؟ اس زمانے میں ایسے افسانے یا تو بہت زیادہ پرانے ہیں یا پھر یہ افسانے بہت زیادہ جدید۔ ان میں ہو سکتا ہے کوئی بہت بڑا فلسفہ چھپا ہو۔ ''وفور'' ۱۵۲ صفحات پر پھیلا ہے۔ اس میں بھی ۱۹ افسانے مشکل سے سو صفحات میں پھیلے ہیں۔ یہی معاملہ ''مکافات'' کا بھی ہے۔ یعنی دونوں مجموعوں میں تقریباً ۲۰۰ صفحات میں ۳۸ افسانے شامل ہیں۔ دونوں مجموعوں کے افسانے ایک ہی مجموعے میں

آسکتے تھے، پھر دو مجموعے لانے کا کیا مقصد؟

''شکوہ، جوابِ شکوہ'' راقم کا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی سال اپریل میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے سبھی افسانے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآنی قصوں اور آیات پر مبنی ہیں۔

''رقص شعلہ'' سہیل ارشد کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں کل گیارہ افسانے ہیں۔ دو افسانہ نگار فیروز عابد اور انیس رفیع اور ایک ناقد و ڈرامہ نگار ظہیر انور کا مضمون ہے، جن سے سہیل ارشد کے افسانوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دراصل سہیل ارشد کے بعض افسانوں کو سمجھنا آسان نہیں۔ ان میں علامتیں، استعارات اور تمثیل پائی جاتی ہے۔ ایسے افسانے جدیدیت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس عہد کے بیشتر افسانوں میں کچھ اس طرح ثقیل علامتوں اور مشکل ترین اسلوب کا گزر ہوتا ہے کہ قصہ پن کہیں اندر گم ہو جاتا ہے۔ سہیل ارشد کے یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ سہیل ارشد کے بھی کئی افسانے علامتی ہیں، جن کا نمائندہ افسانہ ''رقص شعلہ'' ہے۔ گو کہ انیس رفیع نے اس افسانے کو سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، لیکن یہ افسانہ عام قاری کے لئے ذرا مشکل ہے۔ سہیل ارشد کے کچھ افسانے بہت خوبصورت ہیں جو ہندوستان کے نشیب و فراز یعنی زندگی کو بہتر طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایسے افسانوں کا نمائندہ افسانہ ''پنجرہ'' ہے، جو غلامی کی واضح علامت ہے۔ یہ افسانہ باپ بیٹی کے مکالموں سے غلامی اور آزادی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

''روشنان'' ڈاکٹر فریدہ تبسم کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر فریدہ تبسم گلبرگہ کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں خواتین کے حقوق کی بازیافت ہے۔ ملک میں پھیلتا نفرت کا زہر، انسان خاص کر مرد کردار کا بے کردار ہونا، عورتوں کا آزادی کا غلط استعمال، سماج میں ہونے والی عجیب و غریب حرکات و سکنات، رشتوں کی پامالی اور ان کا کھوکھلا پن، مذہب کی بے اثر باتیں، انہیں پریشان کرتی ہیں۔ وہ مذکورہ باتوں کو موضوع بنا کر افسانے قلم بند کرتی ہیں۔

مذکورہ مجموعے میں ان کے اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر محمد شارب، داکٹر رحمت عزیز خان چترالی کے مضامین اور خود کا مضمون شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں افسانہ نگار کے سوانحی کوائف بھی درج ہیں۔ ''آتش کدہ''، ''میری عیدی''، ''جہانِ عشق''، ''زندگی دھوپ، تم گھنا سایہ''، ''کوزہ گر''، ''گرو دکھشنا'' کو ضرور اچھے افسانوں میں شمار ہونا چاہیے۔ ان کے افسانوں میں رومان کی ترنگیں بھی ملتی ہیں جو قاری کے اندر سرایت کر جاتی ہیں۔ ان کا افسانہ قاری کو اپنی کہانی لگنے لگتی ہے۔ ان کے افسانوں کے اسلوب سے متعلق ڈاکٹر رحمت عزیز خان کتاب کے فلیپ پر لکھتے ہیں:

''انہوں نے سادہ بیانیہ کے علاوہ، نیم علامتی، تجریدی، انداز اور داستانوی اسلوب، خطوط اور ڈائری نما اور سائنسی فکشن وغیرہ اسلوب میں افسانے تخلیق کئے ہیں۔ یعنی آسمان تخلیق پر روشنان کی دھنک بن گئے ہیں۔''

''پیاسے لوگ'' ممتاز شارق کے پہلے افسانوی مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن آج سے تقریباً ۳۸ برس قبل ۱۹۸۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس دوسرے ایڈیشن میں ممتاز شارق نے کچھ نئے افسانے اور افسانچوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشن کے ناشر تنویر اختر رومانی کی تحریر اور رضوان واسطی کا دیباچہ شامل ہے۔ اس مجموعے میں کل ۲۲ افسانے، ۱۰ افسانچے اور پہلے ایڈیشن پر ۱۸ لوگوں کی آرا بھی ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کی کہانیاں اور کردار بلکہ مقامات بھی آس پاس کے ہیں۔ ان میں آج سے تیس چالیس برس پہلے کے معاملاتِ زندگی ہیں۔ سماج کا اثر دار اور مالدار شخص جو مکھیا، ٹھیکے دار، سیاست داں کچھ بھی ہو سکتا ہے جو سماج کے دبے کچلے لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ افسانہ ''پیاسے لوگ'' بھی اسی قسم کا افسانہ ہے۔ ممتاز شارق کے افسانچے سماج پر گہرا طنز کرتے ہیں۔

''یہ کہانی نہیں ہے'' معروف و مقبول فکشن نگار ڈاکٹر احمد صغیر کے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل وہ کئی تنقیدی کتب اور ناول دے چکے ہیں۔ افسانوں کی بات کی جائے تو ان کا پہلا مجموعہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' ۱۹۹۵ میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے پانچ افسانوی مجموعے ''انا کو آنے دو''، ''درمیاں کوئی تو ہے''، ''داغ داغ زندگی''، ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے'' شائع ہوئے۔ آج ان کا شمار سینئر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ

''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے''اردو میں دلتوں کی زندگی اور مسائل پر اردو'' کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

''یہ کہانی نہیں ہے'' میں احمد صغیر کے ۲۴ افسانے، غیر مطبوعہ ناول کا ایک باب اور احمد صغیر کے فن پر ناقدین کی آرا شامل ہیں۔احمد صغیر آس پاس سے کہانی اٹھاتے ہیں۔ان کے افسانوں میں عصریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔مجموعے کے ٹائٹل افسانے میں بھی انہوں نے عصریت کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ایک کہانی کار، جادوگر، شہر اور رات اس کہانی کے اہم اجزا ہیں۔این آر سی اور شہر کے نام بدلنے کو بھی طنزاً پیش کیا گیا ہے۔جادوگر ہی کہانی کار ہے جو سب کچھ بدل کے رکھ دیتا ہے۔اس مجموعے کے دیگر اچھے افسانوں میں ''جموا''، ''یہ دیوار بھی گرے گی''، ''لہو رنگ تصویر''، ''فریم سے باہر کی تصویر''، ''بازار''، ''برادری''، ''بساط'' کا شمار ہونا چاہیے۔آنے والے ناول ''خواب تماشا'' کا ایک دلچسپ باب بھی کتاب میں شامل ہے۔

''شطرنج کی بازی'' پٹنہ کی رمانہ تبسم کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔شموئل احمد کے ساتھ ان کی ایک کتاب ''اردو افسانے کی بے وفا عورتیں'' نے کافی شہرت پائی تھی۔ان کے افسانے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ان میں کوئی بہت گہرا فلسفہ، یا کسی بہت بڑے رجحان کے تخم نظر نہیں آتے۔وہ عام سے واقعات کو کہانی بنا دیتی ہیں۔ان کے افسانے سماج میں پھیلے ناسور کے مظہر ہیں۔اس مجموعے میں پندرہ افسانے شامل ہیں۔یہ سبھی افسانے نئے ہیں اور سنجیدہ قرأت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ان کے کئی افسانوں میں دَم نظر آتا ہے مثلاً ''صیاد کا معاہدہ''، ''نروان''، ''بھوک''، ''شطرنج کی بازی''، ''تم بن''، ''زرد پتے''ان کے افسانوں کے تعلق سے کتاب کے فلیپ پر معروف فکشن نگار شموئل احمد لکھتے ہیں:

> ''ان کے افسانے گہرے سیاسی اور سماجی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔رمانہ نے سیاسی و سماجی بدعنوانیوں کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا ہے۔ان کی سوچ اور بے باک لہجہ انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ کرتا ہے۔''

''بے سمت قافلے'' کشمیر کے نوجوان افسانہ نگار طارق شبنم کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کا ایک مجموعہ ''گمشدہ دولت'' شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ان کی ایک اور کتاب ''منتخب افسانے'' ۲۰۲۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔طارق شبنم فیس بک پر ایک ادبی فورم ''ولر ادبی فورم'' کے صدر بھی ہیں، جس کے تحت ہر سال افسانوں کا ایک ایونٹ بھی ہوتا ہے۔

آپ کے دوسرے مجموعے ''بے سمت قافلے'' میں تقریباً ۴۴ افسانے شامل ہیں، جن میں سے بعض افسانے تو بہت ہی اچھے ہیں خاص کر ''ہم اڑن طشتری''، ''حی علی الفلاح''، ''نیا شہر''، ''بے اعتنائی''، ''سونے کا پیالہ''، ''شکور بھنگی''، ''زخمی دلہن''، ''ڈینجر زون''، ''کالی ناگن''، ''علی بابا''، ''سرخ بادل''، ''بے سمت قافلے'' کو ان کے اچھے افسانے کہہ سکتے ہیں۔ان کے افسانوں میں سماج کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ، امن و امان، مذہبی شناخت، بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان کا کرب، خوف و ڈر کا شدید احساس، ملک کا ماحول، انسان کا دہرا کردار وغیرہ جیسے موضوعات و معاملات پائے جاتے ہیں۔ طارق شبنم کے افسانے چونکاتے ہیں۔وہ سماج کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتے رہتے ہیں۔

''جو جہاں ہے وہیں رہے'' ندیم راعی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ان کے افسانے عصری تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتے ہیں بلکہ ان پر کھرے بھی اترتے ہیں۔وہ اپنے آس پاس سے کہانی کا مواد اٹھاتے ہیں۔اس بات کا اعتراف انہوں نے خود بھی ''اپنی بات'' میں کیا ہے۔اس سے قبل وہ دو افسانوی مجموعے ''ایسی بھی اک عید'' اور ''حرف حرف تیرے نام'' دے چکے ہیں۔اس تازہ مجموعے میں ان کے ۲۴ افسانے شامل ہیں۔ان کے کئی افسانے ''کافی ہاؤس''، ''آخری بوسہ''، ''جو جہاں ہے وہیں رہے''، ''پھر تاریخ مل گئی''، ''اندھیری رات''، ''موڈرن دیوداس''، ''تصویر کا رخ''، ''سپنوں کا تاج محل'' اچھے افسانے ہیں۔

''جو جہاں ہے وہیں رہے'' مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ہے۔یہ افسانہ کووڈ ۱۹ کی دلخراش داستان ہے۔ممبئی سے اڈیشہ کا تقریباً ۱۶۰۰ کلو میٹر لمبا سفر، کوئی پیدل، کوئی سائیکل پر، ٹوٹی پھوٹی بیل گاڑیوں اور بھینسا گاڑی سے رواں دواں تھے۔ہر طرف لوگ مر رہے تھے، سفر میں لوگ مر رہے تھے، بوڑھے والدین، چھوٹے بچے، عورتیں پیدل چلنے کے باعث بیمار ہو رہے تھے، مر رہے تھے۔ وملا، اپنی حاملہ ماں کو سائیکل پر لے کر چل رہی ہے۔بہت ہی اچھا افسانہ ہے جو ہمیں جذباتی بنا دیتا ہے۔

''شناخت'' احمد ریاض کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانے سماج میں پھیلی بے چینی اور اضطراب کا مظہر ہیں۔ موجودہ زندگی اور انسان کی مکاری وعیاری، مذہب کا غلط استعمال، آزادی کا ناجائز فائدہ ،عصری تقاضے، کردار کا کھوکھلا پن، رشتوں کی بے حرمتی، قدروں کا زوال وغیرہ احمد ریاض کے موضوعات ہیں۔

اس مجموعے میں احمد ریاض کے ۲۱ افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ معاشرے میں مثبت اقدار کی پختگی کے خواہاں احمد ریاض، اپنے افسانوں کا ایک واضح مقصد رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہماری شناخت جو خالص نہ ہوکر مختلف خانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے، وہ پھر سے واپس آئے اور ہمارے اخلاق وکردار ہماری شناخت کا حوالہ بنے۔ افسانہ ''شناخت'' میں بھی اسی بات کا غم ہے کہ ہم اپنے اخلاق وکردار اور سلوک کو نہ دیکھ کر دوسروں پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ ہم اپنی شناخت بھولتے جا رہے ہیں۔

''اجالے کی طرف'' نذیر فتح پوری کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یوں تو نذیر فتح پوری ۱۹۷۰ء سے ہی افسانے لکھ رہے ہیں، مگر انہوں نے مجموعے کے بارے میں نہیں سوچا۔ ویسے وہ ایک منجھے ہوئے فنکار ہیں۔ وہ شاعر، ناقد، محقق، صحافی، سفر نامہ نگار، افسانچہ نگار، ناول نگار ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔

''اجالے کی طرف'' میں ان کے ۲۴ افسانے شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے ۷۰ء سے اب تک مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں ان کا اسلوب سیدھا سادہ ہے۔ ان میں کوئی بڑا فلسفہ ہے، نہ ہی کسی ٹرینڈ کے شروع ہونے کے اشارے۔ یہ سب عام انسانوں کی کہانیاں ہیں جو قاری کو باندھے رکھتی ہیں۔ ان میں جذبات ہیں، گہرائی ہے، کردار ہیں، قصہ پن ہے، ایک امید ہے جو زندگی بخشتی ہے۔ کئی افسانے، اچھے افسانوں کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ ''روشنی کی تلاش''، ''کبوتروں والی حویلی''، ''سرحد پار سے جواب''، ''اجالے کی طرف''، ''آخری بوند کا سفر''، ''فاصلوں کا کرب'' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو نذیر فتح پوری کو افسانوی دنیا میں زندہ رکھیں گے۔

''زندگی میں پہلی بار'' جمشید پور کے نیاز احمد آسی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ نیاز بہت زمانے سے اس دشت کی سیاحی کر رہے ہیں۔ ان کا مجموعہ بہت تاخیر سے آیا۔

ناز احمد آسی کے اس مجموعے میں چھوٹی بڑی تقریباً ۳۲ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ سبھی کہانیاں سماج اور معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ ان کا انداز پرانا ہوسکتا ہے، مگر ان میں الگ قسم کا تاثر ضرور ہے۔

نیاز احمد آسی کے افسانے ان کے اردگرد گھومتے ہیں۔ ان میں مصنف نے اپنا خونِ جگر جلایا ہے۔ بعض کہانیاں آپ کو آپ بیتی لگیں گی، مگر یہ دراصل جگ بیتی ہیں۔ کتاب میں ان کا ایک مضمون ''میں اور میری کہانیاں'' شامل ہے جس کے مطالعے سے مصنف کے نظریے سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان میں بعض افسانے ضرور ان کی شناخت بنیں گے۔ ان کے اچھے افسانوں میں ''وہ''، ''پاگل''، ''دمِ واپسیں''، ''طوفان آنے والا ہے''، ''زندگی میں پہلی بار''، ''ماں''، ''آخری سوال''، ''گھر واپسی''، ''جاگتے رہو''، ''نوٹ'' کا شمار ضرور ہونا چاہیے۔ ان میں عصری زہرناکی ہے تو بیان کی پرکاری بھی۔ افسانے کا ایک اقتباس دیکھیں:

> ''وہ میرے سوالات کا جواب دیے بغیر میرا ہاتھ پکڑتا ہوا، مجھے گھسیٹ کر دوسری طرف لے گیا۔ 'یہ میرٹھ کی فیروز بلڈنگ ہے، جہاں مظلوم انسانوں کو کمروں میں بند کر کے آگ لگا دی گئی تھی۔ جہاں سارے لوگ جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگئے تھے۔''

(افسانہ ''وہ، زندگی میں پہلی بار'' نیاز احمد آسی، ص ۱۵)

❀❀❀

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

ڈاکٹر مسرت
N.C.P.U.L. Farogh-e-Urdu, Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola,
New Delhi- 110025 (Mob.7838805894)

افسانہ: تعریف، فن، تکنیک اور اجزائے ترکیبی

افسانہ اردو ادب کی مقبول اور نمایاں نثری صنف ہے جو انسانی زندگی کے تجربات، جذبات اور خیالات کو محدود الفاظ میں بڑی گہرائی سے پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگاری کا فن اپنے اندر ایک مکمل دنیا کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے، جس میں زندگی کی حقیقتیں، انسان کے خواب و خیالات اور معاشرتی پیچیدگیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے مختصر پیرائے میں لکھا جاتا ہے، جس کا مقصد قاری کو ایک مختصر، مگر جامع پیغام دینا ہوتا ہے۔ افسانہ اس لحاظ سے دیگر ادبی اصناف سے منفرد ہے کہ اس میں مصنف کو کم الفاظ میں ایک مکمل کہانی بیان کرنی ہوتی ہے جس میں کہانی کا اختتام بھی شامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے افسانے کی جامع تعریف یوں کی ہے:

''افسانہ دراصل زندگی کا عکس ہے جو حقیقت یا تخیل کی صورت میں محدود الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔''

(افسانہ: تنقید اور تعبیر)

یہ تعریف افسانے کی بنیادی خصوصیت کو واضح کرتی ہے کہ افسانہ مختصر ہونے کے باوجود زندگی کی حقیقتوں کا عکاس ہوتا ہے اور قاری کو ایک مخصوص احساس یا تجربے سے روشناس کراتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے تخلیقی عمل میں کسی بھی موضوع کا انتخاب کرتا ہے اور اسے اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ قاری کے لئے محض وقت گزارنے کا ذریعہ نہیں ہو بلکہ اسے ایک ذہنی اور فکری تجربہ بھی فراہم کردے۔

افسانے کی تعریف

افسانہ جیسا کہ ابھی کہا گیا، بنیادی طور پر زندگی کے کسی ایک واقعے، جذباتی کیفیت یا صورتِ حال کا مختصر اور جامع بیان ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات کو مربوط اور اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس کا مقصد قاری کے ذہن میں ایک خاص پیغام یا خیال چھوڑنا ہوتا ہے۔ ایک کامیاب افسانہ وہی ہوتا ہے جو قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لے لے اور اسے زندگی کے کسی پہلو پر سوچنے پر مجبور کردے۔ افسانے کی مختصر ہیئت اس کے اثر کو بڑھاتی ہے کیونکہ مختصر کہانی میں مصنف کو اپنے جذبات اور خیالات کو کم الفاظ اور مؤثر انداز میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری اس امر پر خاص توجہ دیتی ہے کہ کہانی کے مختصر دائرے میں قاری کی دلچسپی برقرار رکھی جائے اور اختتام پر اسے حیرت، خوشی یا افسوس جیسے جذبات میں مبتلا کیا جائے۔ افسانے کی یہی مختصر مگر جامع نوعیت اسے اردو ادب کی دیگر نثری اصناف سے ممتاز کرتی ہے۔ افسانہ نگار کو نہ صرف واقعات کو ترتیب دینا ہوتا ہے بلکہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے فلسفیانہ یا سماجی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ مختصر ہونے کے باوجود ایک وسیع اثرات کا حامل ہوتا ہے۔

افسانے کا فن

افسانہ لکھنا ایک مشکل اور نازک فن ہے کیونکہ مصنف کو محدود الفاظ میں مکمل کہانی بیان کرنی ہوتی ہے۔ افسانے کا فن اس بات پر منحصر ہے کہ افسانہ نگار کس طرح اپنے خیالات اور تجربات کو الفاظ کی ایک چھوٹی سی دنیا میں سمیٹ کر پیش کرتا ہے۔ ایک کامیاب افسانہ وہ ہوتا ہے جو قاری کو ابتدا سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھے اور کہانی کے اختتام پر اسے سوچنے پر مجبور کرے۔ افسانہ محض قصہ گوئی نہیں ہے بلکہ یہ مصنف کے شعور اور لاشعور کی ایک تخلیقی پرواز ہے، جس میں وہ اپنی زندگی کے تجربات کو حوصلے اور مقصدی سمت و رفتار کے ساتھ دکھاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو، جو اردو افسانے کے اہم ترین مصنّفین میں سے ہیں، افسانے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''افسانہ محض قصہ گوئی نہیں بلکہ ایک سوچ، ایک خیال، ایک تجربہ ہے، جو مصنف کے شعور اور لاشعور میں بستا ہوتا ہے۔'' (سعادت حسن منٹو: تخلیقی تجربہ)

منٹو کے اس قول سے افسانے کی گہرائی اور فلسفیانہ پہلو کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ افسانہ صرف کہانی بیان کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ایسا فن ہے جو انسانی زندگی کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے اور قاری کو اس میں شامل کرتا ہے۔ منٹو کے مطابق، افسانہ نگار کا کام صرف واقعات کو ترتیب دینا نہیں بلکہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے جذبات، خیالات اور سوالات کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد قاری کو ایک نئی دنیا میں لے جانا ہوتا ہے جہاں وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نئی نظر سے دیکھ سکے۔

افسانے کی فکری گہرائی

افسانے کی ایک اہم خصوصیت اس کی فکری گہرائی ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں مصنف اپنے خیالات اور فلسفہ کو مختصر پیرائے میں پیش کرتا ہے جس کا مقصد قاری کو زندگی کی تلخ حقیقتوں، سماجی مسائل یا نفسیاتی پیچیدگیوں کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ ایک اچھے افسانے میں صرف واقعات نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے ایک گہری سوچ اور مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اپنی تخلیق میں سماج، انسان اور زندگی کی فلسفیانہ حقیقتوں کو بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے انسانی تجربات کو ایک نئے زاویے سے پیش کرتا ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانے کی یہ فکری گہرائی اسے ایک ادبی شاہکار بناتی ہے کیونکہ یہ مختصر ہونے کے باوجود زندگی کے پیچیدہ مسائل اور جذباتی حالتوں کو سامنے لا دیتی ہے۔

افسانہ اور اسلوب

افسانے کا فن اسلوب اور زبان پر مبنی ہے۔ ایک کامیاب افسانہ نگار وہی ہوتا ہے جو زبان کو خوبصورتی اور سادگی کے ساتھ استعمال کرے تاکہ کہانی کی تاثیر میں اضافہ ہو۔ افسانے کی زبان سادہ، مگر موثر ہوتی ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ ایک اچھا افسانہ وہ ہوتا ہے جس میں الفاظ کی بناوٹ ایسی ہو کہ وہ قاری کو کہانی میں شامل کر لے اور اسے حقیقت کا حصہ بنا دے۔ اسلوب افسانہ نگاری میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ مصنف کا اسلوب ہی کہانی کے تاثر کو قاری تک پہنچاتا ہے۔ مختلف افسانہ نگاروں کا اسلوب ان کے افسانوں کو منفرد بناتا ہے اور یہ اسلوب ہی قاری کے دل میں اثر پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ افسانے کی زبان اور بیان کی خوبصورتی اس کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتی ہے اور یہی خوبی اسے دیگر نثری اصناف سے ممتاز بھی کرتی ہے۔

افسانے کا معاشرتی اور نفسیاتی پہلو

افسانہ محض ایک کہانی نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک معاشرتی اور نفسیاتی تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگار معاشرے کے مسائل، طبقاتی فرق، نسائی تعلقات اور زندگی کی مشکلات کو اپنے افسانے میں پیش کرتا ہے تاکہ قاری ان مسائل پر غور کرے اور ان کے متعلق سوچے۔ افسانہ نگاری میں انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ ہوتا ہے جو مصنف کو اپنے کرداروں کے جذبات اور افکار کو حقیقی انداز میں پیش کرنے میں مدد دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ افسانہ اردو ادب کی ایک اہم اور منفرد نثری صنف ہے جو مختصر الفاظ میں زندگی کے کسی خاص پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ افسانے کا فن اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مصنف اپنے خیالات، تجربات اور احساسات کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کرے تاکہ قاری کو کہانی کے اختتام پر ایک مخصوص پیغام مل سکے۔ افسانہ نگاری کی فنی مہارت میں مصنف کی زبان، اسلوب اور کہانی کی ترتیب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ افسانہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ صرف کہانی کو دلچسپ بنائے بلکہ اس میں گہرائی اور فلسفیانہ پہلو بھی شامل کرے۔ افسانہ زندگی کی حقیقتوں اور انسانی تجربات کی ایک مختصر، مگر جامع عکاسی ہے جو قاری کو ایک نئی دنیا سے روشناس کراتی ہے۔

افسانے کی تکنیک

افسانہ نگاری ایک پیچیدہ تخلیقی عمل ہے جس میں مصنف کو مختصر وقت اور محدود الفاظ میں ایک جامع، دلچسپ اور اثر انگیز کہانی پیش کرنی ہوتی ہے۔ افسانے کی تکنیک وہ ادبی ہنر اور اصول ہیں جن کی مدد سے مصنف کہانی کے بنیادی ڈھانچے کو تخلیق کرتا ہے اور اسے اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ قاری پر گہرا اثر چھوڑے۔ افسانے کی تکنیک مصنف کا ادبی ہتھیار ہوتا ہے جو کہانی کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اسے

قاری کے دل و دماغ میں پائیدار مقام دلانے میں معاون بنتا ہے۔ افسانے کی تکنیک کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ ایک فنکارانہ عمل ہے جس میں کئی ادبی عناصر ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ کردار، پلاٹ، موضوع، فضا اور مکالمے جیسے اجزا کہانی کو تشکیل دینے اور اس کے مقصد کو قاری تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کردار نگاری

کردار افسانے کی جان ہوتے ہیں کیونکہ کہانی کے واقعات اور جذبات کرداروں کے ذریعے ہی قاری تک پہنچتے ہیں۔ ایک اچھے کردار کی تخلیق افسانے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ کردار نگاری میں مصنف کو کردار کی نفسیات، شخصیت، خیالات اور جذبات کو اس انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے کہ قاری خود کو اس کا حصہ محسوس کرے اور اسے حقیقت کے قریب تر پائے۔ احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ:

''افسانہ میں کردار گوشت پوست کے نہیں ہوتے بلکہ
خیالات اور جذبات کے پیکر ہوتے ہیں۔''

اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانے کے کردار محض جسمانی وجود نہیں رکھتے بلکہ ان کے پیچھے گہرے خیالات، جذبات اور فلسفیانہ پہلو ہوتے ہیں۔ ایک کامیاب افسانہ نگار وہ ہوتا ہے جو کردار کے اندر چھپے ہوئے جذبات اور خیالات کو سامنے لائے اور انہیں ایسے انداز میں پیش کرے کہ قاری کو وہ کردار حقیقی لگنے لگے۔ مثال کے طور پر سعادت حسن منٹو کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کا ایشر سنگھ ایک ایسا کردار ہے جس کی نفسیاتی پیچیدگیاں اور جذباتی اضطراب قاری کو شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ ایشر سنگھ کا کردار منٹو کی گہری کردار نگاری کا مظہر ہے جو افسانے کے موضوع اور پیغام کو واضح کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

پلاٹ

پلاٹ کہانی کی ساخت اور ترتیب کا نام ہے۔ ایک مضبوط پلاٹ افسانے کے واقعات کو مربوط رکھتا ہے اور کہانی میں تسلسل اور گہرائی پیدا کرتا ہے۔ پلاٹ کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے کہ قاری ابتدا سے آخر تک کہانی میں محو رہے اور واقعات کی ترتیب اسے کہانی کے انجام تک کھینچ لے جائے۔ افسانے کا پلاٹ محض واقعات کا بیان نہیں ہوتا بلکہ یہ ان واقعات کے پیچھے موجود محرکات اور فلسفہ کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے کا پلاٹ ہمیشہ مختصر ہوتا ہے اور اس میں غیر ضروری تفصیلات نہیں دی جاتیں۔ اس کے برعکس مصنف کو محدود وقت میں ایک واضح اور مربوط کہانی کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ پلاٹ کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ کہانی کے واقعات قاری کی دلچسپی کو کیسے برقرار رکھتے ہیں اور انہیں کہانی کے انجام تک کیسے پہنچاتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں پلاٹ کی یہ سادگی اور گہرائی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے جہاں وہ ایک مختصر کہانی کے ذریعے پیچیدہ انسانی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔

موضوع

افسانے کا موضوع وہ بنیادی فکر یا مسئلہ ہوتا ہے جس کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ موضوع ہی کہانی کی روح ہوتا ہے جو قاری کو ایک خاص پیغام یا فکر دیتا ہے۔ افسانہ نگار عام طور پر اپنے افسانوں میں معاشرتی، نفسیاتی یا فلسفیانہ مسائل کو موضوع بناتا ہے تاکہ وہ اپنے خیالات کو کہانی کے ذریعے بیان کر سکے۔ مثلاً، منٹو کے افسانے اکثر سماجی مسائل، طبقاتی تقسیم اور انسانی زندگی کی تلخیوں کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کے افسانے ''کالی شلوار'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اس بات کی بہترین مثالیں ہیں جہاں افسانے کے موضوعات معاشرتی نابرابری اور انسانی نفسیات کو اجاگر کرتے ہیں۔ افسانے کا موضوع نہ صرف کہانی کے واقعات کو تشکیل دیتا ہے بلکہ قاری کو ایک فکری اور جذباتی تجربہ فراہم کرتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہوتا ہے جو کہانی کو معنویت دیتا ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

فضا اور ماحول سازی

افسانے میں فضا اور ماحول سازی بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ قاری کو کہانی کی دنیا میں شامل کرتی ہے۔ کہانی کا ماحول وہ جذباتی اور فکری پس منظر ہوتا ہے جس میں کردار اپنے عمل اور خیالات کو انجام دیتے ہیں۔ ایک کامیاب افسانہ نگار وہی ہوتا ہے جو کہانی کی فضا کو اس قدر حقیقی بناتا ہے کہ قاری اس میں مکمل طور پر غرق ہو جاتا ہے۔ فضا سازی میں افسانہ نگار کو جگہ، وقت اور ماحول کو اس انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے کہ قاری اسے حقیقت کے قریب تر محسوس کرے۔ مثلاً کرشن چندر کے

افسانوں میں اُس مقام پر فضا سازی کا کمال دیکھنے کو ملتا ہے جہاں وہ اپنے افسانوں میں سماجی اور طبقاتی تقسیم کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں ماحول اور فضا کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری خود کو اس دنیا کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔افسانے کی فضا سازی میں جگہ اور وقت کا انتخاب بھی بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ یہ قاری کے جذبات اور کہانی کے اثر کو گہرائی فراہم کرتا ہے۔

مکالمے

مکالمے افسانے کے کرداروں کے خیالات، جذبات اور شخصیات کو ظاہر کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ایک کامیاب مکالمہ کہانی کو حقیقت کے قریب تر لاتا ہے اور کرداروں کو زندہ کر دیتا ہے۔ مکالمے نہ صرف کرداروں کے جذبات اور افکار کو پیش کرتے ہیں بلکہ کہانی کے موضوع اور پلاٹ کو بھی آگے بڑھاتے ہیں۔افسانے میں مکالمات کا استعمال اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ کہانی کی فضا اور کرداروں کی شخصیت کو واضح کرتے ہیں۔منٹو کے افسانوں میں مکالمات کی خاص اہمیت ہے، کیوں کہ وہ ان کے کرداروں کے مکالمے کہانی کی گہرائی اور فلسفیانہ پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔مکالمے کا اثر قاری کے ذہن پر دیرپا ہوتا ہے کیوں کہ یہ کرداروں کی شخصیت اور ان کے جذبات کو واضح طور پر پیش کرتا ہے۔ایک اچھا مکالمہ وہ ہوتا ہے جو کہانی کے تاثر کو بڑھا دے اور قاری کو کرداروں کے ساتھ جذباتی طور پر جوڑ دے۔

مختصر یہ کہ افسانے کی تکنیک ایک اہم عنصر ہے جو کہانی کو مختصر،مگر جامع انداز میں قاری کے سامنے پیش کرتی ہے۔کردار نگاری، پلاٹ، موضوع، فضا اور مکالمات جیسے اجزا ایک کامیاب افسانے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ افسانہ نگار کو ان تمام تکنیکوں کو بہترین طریقے سے استعمال کرنا آنا چاہیے تاکہ کہانی قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑے۔افسانے کا فن دراصل اس تکنیکی مہارت کا مجموعہ ہے جس میں مصنف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر کہانی کو زندہ کرتا ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ یہی تکنیک افسانے کو ایک مکمل ادبی فن پارہ بناتی ہے اور قاری کے لیے ایک دلچسپ، فکرانگیز اور دلکش تجربہ فراہم کرتی ہے۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی

افسانے کے اجزائے ترکیبی وہ عناصر ہیں جو کہانی کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور اسے ایک مکمل اور جامع ہیئت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ اجزا نہ صرف افسانے کی ساخت کو مضبوط بناتے ہیں بلکہ اسے ایسا تجربہ بھی بناتے ہیں جو قاری کے ذہن و دل پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ایک اچھے افسانے کی بنیاد ان اجزائے ترکیبی پر ہی ہوتی ہے اور یہ اجزا مل کر کہانی کو ایک مکمل فنی اظہار بنا دیتے ہیں۔

ابتدا

افسانے کی ابتدا وہ اہم حصہ ہوتا ہے جو قاری کو کہانی کی دنیا میں لے جاتا ہے اور اسے فوری طور پر کہانی کے ماحول اور موضوع سے جوڑ دیتا ہے۔ افسانہ چونکہ مختصر ہوتا ہے، اس لیے ابتدا کا مقصد بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب افسانہ نگار قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور اسے کہانی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔اگر افسانے کی ابتدا مؤثر اور دلکش ہو تو قاری کہانی کو پڑھنے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے اور اس میں مزید دلچسپی لینے لگتا ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ افسانے کی ابتدا کہانی کی کامیابی کا پہلا قدم ہے۔

افسانہ نگار کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ابتدا میں ہی کہانی کی فضا اور موضوع کا تعارف کرا دے، مگر اس تعارف کو بہت زیادہ تفصیلات میں نہیں لے جایا جا سکتا، کیونکہ افسانہ مختصر صنف ہے اور اس میں طوالت کی گنجائش نہیں ہوتی۔

افسانے کی ابتدا میں کرداروں کی ابتدائی جھلک، ماحول کی کیفیت، یا کسی اہم واقعے کی پیشگی جھلک دکھا کر قاری کو کہانی کے اندر دھکیل دینا افسانہ نگار کا مقصد ہوتا ہے۔ایک کامیاب افسانہ نگار یہ بخوبی سمجھتا ہے کہ ابتدا وہ موقع ہے جہاں کہانی کا پہلا اور اہم تاثر قاری کے ذہن میں قائم ہوتا ہے۔منٹو کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کی ابتدا اس کی بہترین مثال ہے۔منٹو نے افسانے کی شروعات میں ہی مرکزی کردار کی داخلی کشمکش اور تناؤ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔افسانے کے پہلے چند جملے ہی قاری کو کہانی کے اندر کھینچ لیتے ہیں اور کہانی کا دلچسپ اور پریشان کن موڈ قاری کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ جاننا چاہے کہ آگے

کیا ہونے والا ہے۔ افسانے کی ابتدا میں ہی منٹو کردار کے ذہنی اور جذباتی حالات کی جھلک دے کر کہانی کے بنیادی تناؤ کو سامنے لے آتے ہیں۔ اس طرح قاری فوراً کہانی کے ماحول میں جذب ہو جاتا ہے اور اس کی دلچسپی کہانی کے ہر موڑ پر برقرار رہتی ہے۔

اسی طرح، کرشن چندر کے افسانے ''کالو بھنگی'' کی ابتدا بھی انتہائی مؤثر ہے۔ کہانی کا آغاز ایک سادہ منظر سے ہوتا ہے، جہاں معمول کی زندگی کی جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں، لیکن ان جھلکیوں میں ہی کرشن چندر اس سماجی پس منظر کو بڑی عمدگی سے بیان کرتے ہیں جس میں کہانی پروان چڑھتی ہے۔ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک عام سی دنیا میں داخل ہوا ہے، لیکن جلد ہی کہانی کی گہرائی اور پیچیدگی سامنے آجاتی ہے اور قاری اس دنیا میں کھو جاتا ہے۔ کرشن چندر نے افسانے کی ابتدا میں روزمرہ زندگی کے ایک عام سے کردار کو سامنے لاتے ہوئے سماجی مسائل اور طبقاتی فرق کو جس خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے، وہ ان کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

افسانے کی ابتدا میں مصنف کے لیے زبان اور اسلوب کا انتخاب بھی انتہائی اہم ہوتا ہے۔ مصنف کو ایسے الفاظ اور اسلوب کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو کہانی کے مزاج کے مطابق ہوں اور حساس قاری کے ذہن میں دلچسپی اور تجسس پیدا کریں۔ جیسے ہی قاری افسانے کی پہلی سطر پڑھتا ہے، وہ اسلوب کے ذریعے کہانی کے موڈ اور لہجے کو محسوس کر لیتا ہے۔ ایک ماہر افسانہ نگار اپنی تکنیک کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ قاری کو نہ صرف کہانی کی فضا میں لائے بلکہ اسے قاری کے دل و دماغ پر بھی اثر انداز کرے۔

افسانے کی ابتدائی سطریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کہانی کس نوعیت کی ہوگی، اس میں کیا مسائل یا موضوعات زیر بحث آئیں گے، اور قاری کو آگے کیا توقعات رکھنی چاہئیں۔ ایک اچھی ابتدا قاری کو متجسس بنا دیتی ہے اور وہ پوری کہانی پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اوج

اوج کہانی کا وہ حصہ ہوتا ہے جہاں کہانی اپنے عروج پر پہنچتی ہے اور اس کا تنازعہ یا کشمکش پوری شدت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب کہانی کے کردار اپنی جذباتی یا عملی حدود تک پہنچ جاتے ہیں اور قاری بھی کہانی کی شدت میں گہرائی سے ڈوب جاتا ہے۔

اوج دراصل کہانی کا سب سے اہم اور سنسنی خیز مرحلہ ہوتا ہے، جہاں کہانی کے تمام عناصر، جیسے پلاٹ، کردار اور موضوع یکجا ہو کر ایک مرکزی نکتے پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر قاری کو کہانی میں پیدا ہونے والے تنازعے کا جواب ملتا ہے یا کم از کم تنازعہ پوری طرح سے سامنے آجاتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب کہانی کی دلچسپی اپنے عروج پر ہوتی ہے اور قاری اس بات کا شدت سے منتظر ہوتا ہے کہ کہانی کا انجام کیا ہوگا۔

اوج کا مقصد کہانی میں تنازعہ یا کشمکش کو اس حد تک شدت دینا ہوتا ہے کہ قاری جذباتی طور پر کہانی میں مزید گہرائی تک چلا جائے۔ اس مرحلے پر کرداروں کے اندرونی اور بیرونی حالات، ان کے فیصلے، اور ان کے اعمال کہانی کی اصل روح کو سامنے لاتے ہیں۔

ایک کامیاب اوج وہ ہوتا ہے جو قاری کو چونکا دے یا اسے کہانی کے ساتھ مکمل طور پر منسلک کر دے۔ افسانہ نگار کی تخلیقی صلاحیتیں اس مقام پر امتحان میں ہوتی ہیں، کیونکہ اسے نہ صرف کہانی کے تنازعے کو انتہائی مؤثر انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ قاری کی دلچسپی اور تجسس کو برقرار بھی رکھنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، پریم چند کے مشہور افسانے ''کفن'' میں اوج کا لمحہ اس وقت آتا ہے جب گھیسو اور مادھو اپنی غربت اور بے حسی کے درمیان انسانی جذبات کے تضاد میں الجھ جاتے ہیں۔

کہانی کی شروعات میں ہمیں ان دونوں کرداروں کی محرومی اور بدحالی نظر آتی ہے، لیکن اوج کے مرحلے پر ان کی مجبوری اور انسانی بے حسی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ لمحہ قاری کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ غریبوں کی زندگی کی کربناک حقیقت کو گہرائی سے سمجھے۔ یہاں پریم چند نے غربت اور انسانی بے حسی کو ایک گہرے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے، جس سے کہانی کا پیغام اور زیادہ اثر انداز ہو جاتا ہے۔

اوج کے مرحلے پر کہانی کا توازن برقرار رکھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اگر اس مرحلے پر کہانی بہت زیادہ پیچیدہ یا غیر ضروری تفصیلات میں الجھ جائے تو قاری کی دلچسپی ختم ہو سکتی ہے، اس لیے ایک ماہر افسانہ نگار اپنے بیانیے کو بہت سنبھال کر اور سلیقے سے اوج تک پہنچاتا

ہے تا کہ قاری کی توجہ برقرار رہے اور وہ کہانی کی جذباتی شدت میں مبتلا ہو جائے۔ پریم چند جیسے افسانہ نگار اس بات کا بخوبی ادراک رکھتے تھے کہ اوج پر پہنچ کر کہانی کا ہر جز قاری کو جھنجھوڑ دے اور اس کے ذہن میں کہانی کا اثر دیرپا قائم رہے۔

اوج کے بعد کہانی کا انجام آتا ہے، لیکن اوج کا لمحہ اکثر قاری کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں قاری کو کرداروں کے فیصلے اور کہانی کے پیغام کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسانے کی یہ خصوصیت اسے دیگر نثری اصناف سے منفرد بناتی ہے کیونکہ ایک مختصر کہانی میں اوج کے ذریعے جذباتی یا فلسفیانہ مسائل کو انتہائی مؤثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس طرح اوج کہانی کا نہ صرف ایک اہم حصہ ہوتا ہے، بلکہ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب قاری پوری شدت کے ساتھ کہانی میں شامل ہوتا ہے اور کہانی کا پیغام یا تجربہ اس کے ذہن میں گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

کلائمکس

کلائمکس کہانی کا وہ اہم موڑ ہوتا ہے جہاں سے قاری کو کہانی کے اصل انجام یا نتیجے کا اندازہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی کا فیصلہ کن لمحہ ہوتا ہے، جس میں تمام واقعات اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتے ہیں اور کہانی کے اہم مسائل یا تنازعات کا حل سامنے آنے لگتا ہے۔

کلائمکس کہانی کی پیچیدگیوں کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس مرحلے پر قاری کو کرداروں کی تقدیر اور کہانی کے اصل پیغام کا واضح ادراک ہوتا ہے۔ کلائمکس کا مقصد نہ صرف کہانی کے مختلف عناصر کو یکجا کرنا ہوتا ہے بلکہ یہ قاری کو اس سوال کا جواب بھی دیتا ہے جس کے لیے وہ کہانی کے آغاز سے انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

کلائمکس میں کہانی کے تمام تر واقعات ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اور کرداروں کے درمیان جاری کشمکش کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ کہانی کے اس حصے میں قاری کو کہانی کے اصل مطلب، پیغام، یا فلسفے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے اور اکثر اس مقام پر کہانی قاری کو چونکا دیتی ہے یا جذباتی طور پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔

کلائمکس میں کہانی کی تمام گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں اور وہ تمام سوالات جو کہانی کے دوران اٹھائے گئے تھے، ان کے جوابات ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں کہانی کی تمام تر محنت اور کشمکش کا حاصل سامنے آتا ہے۔ اس لمحے میں افسانہ نگار کی صلاحیتیں پوری طرح اجاگر ہوتی ہیں۔

ایک اچھا کلائمکس قاری کو ایک نفسیاتی یا فکری تسکین فراہم کرتا ہے، کیونکہ یہاں کہانی کے تمام عناصر اپنے حل کو پہنچتے ہیں اور کہانی اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتی ہے۔

کلائمکس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کو اس کے ذہن میں پیدا ہونے والی تمام تشویش اور بے چینی کا تسلی بخش جواب دیا جائے۔ اس لمحے میں کرداروں کے فیصلے اور ان کے اعمال قاری کے سامنے واضح ہو جاتے ہیں اور کہانی کے مرکزی خیال یا پیغام کا خلاصہ اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کا کلائمکس ایک انتہائی جذباتی اور چونکا دینے والا لمحہ ہے۔ اس کہانی میں سراج الدین اپنی گمشدہ بیٹی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور کئی تکالیف سے گزرتا ہے۔ کہانی کے کلائمکس میں، جب سراج الدین کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیٹی زندہ ہے، تو یہ لمحہ نہ صرف کہانی کے واقعات کو مکمل کرتا ہے بلکہ انسانی زندگی کے المیوں کو بھی نہایت بیباکی سے اور دردناک انداز میں سامنے لاتا ہے۔ یہاں کلائمکس نہ صرف کہانی کے انجام کو پہنچاتا ہے بلکہ قاری کو انسانی فطرت، ظلم، اور زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں گہرے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح کلائمکس قاری کے لیے وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں کہانی کا اصل مفہوم اور پیغام پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کہانی میں باقی رہ جانے والی تمام جزوی پیچیدگیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں، اور کہانی قاری کو ایک مکمل اور تسلی بخش انجام تک لے جاتی ہے۔ کلائمکس کہانی کی کامیابی کا ایک اہم پیمانہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ قاری کی دلچسپی اور اس کی ذہنی و جذباتی شمولیت کو بامعنی انجام تک پہنچاتا ہے۔

اختتام

اختتام کہانی کا وہ آخری حصہ ہوتا ہے جس میں کہانی کی تمام تر تفصیلات کو سمیٹ کر ایک جامع نتیجہ پیش کیا جاتا ہے، اسے ہم تھوڑی دیر

کے لئے افسانے کا خود افسانہ نگار کے قلم سے واقعاتی خلاصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اختتام کا مقصد قاری کے ذہن میں کہانی کا آخری تاثر چھوڑنا ہوتا ہے۔ ایک کامیاب اختتام وہی ہوتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرے اور کہانی کے اثر کو دیرپا بنائے۔

اختتام کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ قاری کو کہانی کے تجربے کا نچوڑ فراہم کرتا ہے۔ بعض اوقات اختتام واضح ہوتا ہے اور کبھی اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ قاری اپنی تشریح خود کرے۔ کرشن چندر کے افسانے ''مہالکشمی کا پل'' کا اختتام قاری کے سامنے ایک سوالیہ نشان چھوڑ دیتا ہے کہ کیا زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کر لینا ہی انسانی زندگی کا مقدر ہے؟ اختتام میں کہانی کا مرکزی پیغام قاری کے ذہن میں پختہ ہو جاتا ہے اور افسانہ اپنا اثر چھوڑ کر قاری کو فکری طور پر محور کھتا ہے۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی وہ عناصر ہیں جو کہانی کو مکمل اور موثر بناتے ہیں۔ ابتدا، اوج، کلائمکس اور اختتام ہر ایک جز واپنے طور پر اہمیت رکھتا ہے اور کہانی کی کامیابی کا دارومدار ان اجزا کی درست ترتیب اور پیشکش پر ہوتا ہے۔ افسانے کی یہ ساخت نہ صرف کہانی کے تاثر کو بڑھاتی ہے بلکہ قاری کو ایک مکمل تجربہ فراہم کرتی ہے۔ افسانے کے یہ اجزا مصنف کے تخلیقی فن کا مظہر ہوتے ہیں اور ان کی مدد سے کہانی قاری کے ذہن میں دیرپا نقش چھوڑتی ہے۔ منٹو، پریم چند اور کرشن چندر جیسے افسانہ نگاروں نے ان اجزاء کو اپنے فن میں اس قدر مہارت سے برتا ہے کہ ان کے افسانے اردو ادب میں لازوال بن چکے ہیں۔ ایک اچھا افسانہ وہی ہوتا ہے جو ان اجزائے ترکیبی کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے تجربات اور احساسات کو خوبصورتی سے پیش کرے۔

افسانے کا تنقیدی جائزہ

افسانہ نثر کی ایک ایسی صنف ہے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی ایک مکمل دنیا کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو محدود الفاظ، مگر جامع انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو تھوڑی دیر کے لیے ایک منفرد تجربہ فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے وہ نہ صرف کہانی کو سمجھتا ہے بلکہ اس کے ذریعے انسانی جذبات، حالات اور معاشرتی مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

افسانہ اس لحاظ سے ایک بہت ہی خاص اور اہم صنف ہے کہ یہ مختصر ہونے کے باوجود گہرے معانی اور وسیع تجربات کو سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جہاں ایک ناول یا طویل کہانی تفصیل سے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتی ہے وہاں افسانہ ایک مخصوص لمحے یا واقعے کو نمایاں کر کے اس کی اہمیت اور اثرات کو اُجاگر کرتا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

> ''افسانہ نہ صرف قصہ ہوتا ہے بلکہ ایک گہرا اور عمیق تجربہ ہوتا ہے، جو قاری کے شعور کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور اسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔'' (رشید احمد صدیقی: افسانے کی روایت)

افسانے کی مختصر ہیئت اس کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے اور چیلنج بھی۔ ایک کامیاب افسانہ نگار وہی ہوتا ہے جو کم الفاظ میں ایک مکمل کہانی بیان کر سکے جس میں نہ صرف واقعہ ہو بلکہ ایک گہرا پیغام بھی ہو۔ افسانے کا مقصد محض کہانی سنانا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے کسی فکر، تجربے یا انسانی حالت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے میں اختصار کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنا بہت اہم ہوتا ہے۔ منٹو کے افسانے اس بات کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں، مگر ان میں جو تجربہ یا پیغام ہوتا ہے وہ قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ ''کھول دو'' ایک مختصر کہانی ہے، لیکن اس میں منٹو نے جس طرح انسانیت کے المیے کو بیان کیا ہے وہ افسانے کی مختصر ہیئت میں ہی انسانی جذبات کی گہرائی کو سامنے لاتا ہے۔

افسانے کا نقطہ نظر اور تجربہ

افسانے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مخصوص نقطہ نظر یا تجربے کو پیش کیا جاتا ہے، جس کے ذریعے افسانہ نگار اپنے خیالات، مشاہدات اور تجربات کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ مختصر ہونے کی وجہ سے بہت محدود الفاظ میں کہانی کا بنیادی خیال اور موضوع بیان کرتا ہے، اس لیے ہر لفظ اور جملے کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس میں غیر ضروری تفصیلات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ مصنف کو کہانی کو جامع انداز میں اس طرح ترتیب دینا ہوتا ہے کہ قاری فوراً موضوع کی گہرائی اور مقصد کو سمجھ سکے۔ مثال کے طور پر، پریم چند کا افسانہ ''کفن'' بظاہر ایک سادہ اور مختصر کہانی ہے، لیکن اس میں غربت،

بے حسی اور انسانی فطرت کے تضادات کو اتنی مہارت سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری کو یہ کہانی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پریم چند نے محض چند کرداروں اور ایک مختصر واقعے کے ذریعے سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے افسانے کے نقطہ نظر کو انتہائی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

افسانے کی اثر پذیری

افسانے کی دوسری اہم خصوصیت اس کی اثر پذیری ہے، جو قاری کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ چونکہ افسانہ مختصر ہوتا ہے، اس لیے اس کا تاثر فوری اور شدید ہوتا ہے۔ ایک اچھا افسانہ قاری کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، اور جب قاری کہانی کے اختتام پر پہنچتا ہے تو وہ ایک گہرے تجربے سے گزرتا ہے۔ افسانہ نگار کی تخلیقی صلاحیت کا امتحان اسی میں ہے کہ وہ کس طرح کہانی کے اجزا کو اس انداز میں ترتیب دیتا ہے کہ کہانی قاری کو نہ صرف دلچسپی میں مبتلا کرے، بلکہ اسے سوچنے اور گہرے معنوں کو سمجھنے پر مجبور بھی کرے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' اس کی بہترین مثال ہے، جس میں مذہب اور انسانیت کے مابین تضاد اور محبت کے جذبات کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قاری پر اس کا اثر دیر پا رہتا ہے اور وہ کہانی کے فلسفے کو محسوس کرتا ہے۔

افسانے کی فنی خوبیاں

افسانہ نگاری میں فنی خوبیوں کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے۔ کامیاب افسانہ وہی ہے جس میں مصنف اپنی زبان، اسلوب اور تکنیک کو اس مہارت سے استعمال کرے کہ کہانی کے موضوع کی خوبصورتی اور اثر میں اضافہ ہو۔ افسانے میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے اور ماحول سازی جیسے فنی عناصر مل کر ایک مکمل فن پارہ تخلیق کرتے ہیں۔ چونکہ افسانہ مختصر ہوتا ہے، اس لیے افسانہ نگار کو ہر جزو کا انتخاب اور اس کی پیشکش نہایت سوچ سمجھ کر کرنی ہوتی ہے، تاکہ قاری پر کہانی کا ہر پہلو مکمل طور پر اثر انداز ہو۔ کرشن چندر کا افسانہ ''مہالکشمی کا پل'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے، جس میں مختصر، مگر جامع انداز میں کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کی فنی خوبیاں ہر جملے میں جھلکتی ہیں اور کرشن چندر نے نفسیاتی گہرائی کے ساتھ کہانی کو اس قدر خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے کہ قاری ہر پہلو کو اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم دیکھتا ہے۔

افسانے کا فلسفیانہ پہلو

افسانے کا فلسفیانہ پہلو بھی اس کی اہم خصوصیت ہے، جو اسے دیگر نثری اصناف سے منفرد بناتا ہے۔ ایک کامیاب افسانہ کسی نہ کسی گہرے فلسفیانہ یا سماجی مسئلے کو پیش کرتا ہے اور یہ وہی خصوصیت ہے جو افسانے کو بظاہر مختصر ہوتے ہوئے بھی معنویت سے بھرپور بناتی ہے۔ افسانہ مختصر ہوتا ہے، لیکن اس کے پیچھے وسیع سوچ اور فکری گہرائی ہوتی ہے۔ سعادت حسن منٹو کے افسانے فلسفیانہ اور سماجی مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیاں محض واقعات کا بیان نہیں ہوتیں بلکہ وہ انسانی نفسیات اور سماجی رویوں کے پیچیدہ پہلوؤں کو سامنے لاتی ہیں۔ ''ٹھنڈا گوشت'' جیسا افسانہ منٹو کی اسی فلسفیانہ سوچ کی نمائندگی کرتا ہے، جس میں انسانی جذبات اور سماجی رویوں کے تضادات کو نہایت گہرائی اور فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری کو ایسا لگتا ہے کہ وہ صرف ایک کہانی نہیں پڑھ رہا بلکہ ایک گہری فکری دنیا میں داخل ہو رہا ہے۔

نتیجہ

مذکورہ تفصیلوں سے یہ نتیجہ کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ افسانہ، اپنی مختصر ہیئت کے باوجود، ایک مکمل دنیا کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ مختصر ہونے کے باوجود انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں، تجربات، احساسات اور حالات کو اتنے جامع اور مربوط انداز میں پیش کرتا ہے کہ قاری گہرائی میں جا کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ افسانہ، وقت اور الفاظ کی قید میں رہتے ہوئے بھی، اپنے اندر ایک وسیع تر معنی اور تجربہ سموئے ہوتا ہے۔ یہی مختصر ہیئت اس کی سب سے بڑی خصوصیت اور چیلنج ہے، کیونکہ مصنف کو کم سے کم الفاظ میں ایک مکمل کہانی کو اس طرح بیان کرنا ہوتا ہے کہ اس کی گہرائی اور معنویت برقرار رہے۔

افسانے کی یہ خصوصیت اسے دیگر نثری اصناف سے ممتاز کرتی ہے۔ اس میں ہر لفظ اور ہر جملے کی اہمیت ہوتی ہے، کیونکہ الفاظ کا انتخاب کہانی کے مفہوم اور تاثر کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ افسانہ نگار کی سب سے بڑی صلاحیت یہی ہوتی ہے کہ وہ مختصر الفاظ میں ایک وسیع خیال یا تجربہ پیش کرے، جس سے قاری نہ صرف لطف اندوز ہو بلکہ

کہانی کے پیغام یا تجربے کو بھی مکمل طور پر سمجھ سکے۔ رشید احمد صدیقی کا یہ بیان پہلے بھی نقل ہو چکا ہے کہ:

''افسانہ نہ صرف ایک قصہ ہوتا ہے بلکہ ایک گہرا اور عمیق
تجربہ بھی ہوتا ہے، جو قاری کے شعور کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور
اسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔''

بلاشبہ رشید احمد صدیقی کے ان الفاظ میں افسانے کے جوہر کو واضح کیا گیا ہے۔ افسانہ محض واقعات کا سلسلہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہ طاقتور فنی رویہ ہوتا ہے جو قاری کے ذہن میں ایک طوفان برپا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جہاں مختصر واقعات اور کرداروں کے ذریعے بڑے بڑے فلسفیانہ، سماجی اور نفسیاتی مسائل کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

اچھا افسانہ وہی ہے جو اپنے محدود الفاظ میں ایک گہرے تجربے کو سموئے۔ اس کی کہانی ایسی ہو کہ قاری کو اپنے اندر جذب کرے، اسے اپنے کرداروں اور واقعات میں محو کر دے اور جب افسانہ ختم ہو، تو قاری کو ایک گہرے فکری یا جذباتی تجربے سے گزار چکا ہو۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانے اسی اصول پر قائم ہیں۔ ان کی کہانیاں بظاہر مختصر اور سادہ ہوتی ہیں، لیکن ان کے اندر چھپے ہوئے معنی اور جذبات اتنے گہرے اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ قاری کو حیران کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، پریم چند کا افسانہ ''کفن'' ایک انتہائی سادہ سی کہانی ہے، جس میں باپ اور بیٹا اپنی بیوی/ ماں کے مرنے کے بعد کفن خریدنے کے بجائے شراب پینے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس مختصر کہانی میں غربت، بے حسی اور انسانی فطرت کے تضادات کو اتنی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری کو نہ صرف یہ کہانی متاثر کرتی ہے، بلکہ اسے زندگی کے بڑے فلسفیانہ سوالات پر بھی غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پریم چند نے محدود الفاظ میں اس افسانے کے ذریعہ جو پیغام دیا ہے وہ ایک مکمل ناول یا طویل تحریر میں بھی نہیں دیا جاسکتا۔

افسانہ نگار کی تخلیقی صلاحیت کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ وہ کہانی کے اجزا، یعنی پلاٹ، کردار، مکالمے اور ماحول کو اس قدر مربوط اور جامع انداز میں پیش کرے کہ قاری افسانے کے اختتام تک اپنی دلچسپی برقرار رکھ سکے۔ یہی افسانے کی کامیابی ہے کہ وہ مختصر ہونے کے باوجود قاری کو ایک مکمل اور بھرپور تجربہ فراہم کرے۔ اردو ادب میں افسانہ نگاری کی یہ روایت انتہائی اہم اور مقبول ہے، کیونکہ اس میں قاری کو نہ صرف تفریح ملتی ہے، بلکہ وہ گہرے معنوی تجربات سے بھی گزرتا ہے۔

اردو افسانے کی اسی ہمہ گیری اور اثر پذیری نے اسے ادب کی ایک اہم صنف بنا دیا ہے۔ افسانہ نگاری نہ صرف ایک ادبی فن ہے بلکہ یہ ایک سماجی آئینہ بھی ہے، جس میں معاشرتی مسائل، انسانی جذبات اور زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کو انتہائی مختصر، مگر مؤثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جو قاری کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے اور اسے سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی ایک نئی راہ دکھاتی ہے۔ یہی افسانے کی وہ خوبی ہے جس نے اسے اردو ادب میں ہمیشہ کے لیے زندہ اور مقبول بنا دیا ہے۔ ❁❁

عمدہ اور صائب نسیب

عمدہ اور صائب نسیب وہی ہے جس میں فرط رنج وغم اور سوزشِ قلب و جگر کے شواہد بکثرت موجود ہوں اور وہی نسیب قابل مدح سمجھی جائے گی جس میں محبت اور رقت قلب کا پہلو بہ نسبت خشونت اور دلیری کے اور خشوع وانکسار و ذلت کا حصہ بہ اعتبار عزت اور حمیت کے زیادہ غالب ہو اور لازم ہے کہ غزل میں جو مضمون بھی ہو اُس میں عاجزی و ذلت پسندی و نرم خوئی کی پوری رعایت ہو اور وہ حمیت و حفظ آبرو اور پختگی ادارہ سے کوئی واسطہ نہ رکھتا ہو۔ یعنی غزل میں عاشق کو اس کا اظہار کرنا چاہئے کہ محبت نے اُس کو ذلیل ورسوا کر دیا ہے، نہ اُس میں اب کوئی طاقت باقی رہی، نہ قدرت، پس جب غزل مذکورہ حدود کے اندر ہوگی تو وہ درست کہے جانے کے قابل ہوگی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اظہار شوق کرنے اور چلنے والی ہواؤں اور چمکنے والی بجلیوں اور نغمہ زن پرندوں اور چکر لگانے والے خیالوں اور ویران مکانات کے نشانوں اور مٹے ہوئے کھنڈر کے آثار کے ذریعے سے منازلِ احباب کی یادگار تازہ کرنے کو بھی داخل نسیب قرار دیا جاتا ہے اور ضروری ہے کہ جب ان باتوں کا ذکر ہو تو اس طرح ذکر ہو کہ اُس سے انتہائی حسرت، مایوسی اور گزرنے والے صدمات اور دلی جذبات کا پتہ چلتا ہو۔

(عقد السحر فی شرح نقد الشعر، ص۱۲۹)

ڈاکٹر فتح عالم
A-8 "Galaxy Apartment" Qila Road, Shamshad Market, Civil Line,
Aligarh - 202001 (Mob. 8218656661)

پھندنے: ایک تجزیاتی مطالعہ

اردو افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ متنازع فیہ نام سعادت حسن منٹو کا ہے، جنہیں کبھی ترقی پسند اور رجعت پسند کہا گیا تو کبھی ان کی کہانیوں کو جنس پرستی، انحطاط اور فحش نگاری کی بدترین مثال قرار دیا گیا اور زندگی کی گونا گوں حقیقتوں کو جرأت مندی سے پیش کر دینے والے اس سچے فنکار پر ''ٹھنڈا گوشت''، ''دھواں''، ''کالی شلوار''، ''کھول دو''، ''اوپر نیچے درمیان''، ''بو'' اور ''پھندنے'' جیسے افسانے لکھنے کے جرم میں کئی بار مقدمے چلائے گئے۔

منٹو کے افسانوں کی اہم خصوصیت اس کے کرداروں کی انفرادیت ہے۔ انہوں نے اردو افسانے کو جیتے جاگتے اور نمائندہ کردار دیے ہیں۔ ''بابو گوپی ناتھ''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''موذیل''، ''جانکی''، ''دتقی''، ''کاتب''، ''نیلم'' اور ''حافظ منظور'' وغیرہ یہ سب موجودہ دور کے تضادوں کے حامل ہیں۔ منٹو کے کئی افسانے تخلیقی اور فنی پیرایۂ اظہار کے اعتبار سے اہم ہیں۔ ان میں ایک ''پھندنے'' افسانہ بھی ہے۔ جدید اردو افسانے میں منٹو کے ''پھندنے'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعض ناقدین نے اسی سے جدید افسانہ کا آغاز تسلیم کیا ہے۔

''پھندنے'' ایک استعاراتی کہانی ہے۔ یہ منٹو کا واحد افسانہ ہے جس میں انھوں نے روایتی طرزِ بیانیہ سے مکمل طور پر انحراف و اجتناب برتا ہے۔ نہ اس افسانے میں کوئی واضح پلاٹ ہے، نہ کردار، سب کچھ مبہم اور دھندلکا سا نظر آتا ہے۔ منٹو نے اس کہانی میں شعور کی رو اور آزاد تلازمۂ خیال، اشاریت اور علامتی تکنیک سے کام لیا ہے۔

''پھندنے'' منٹو کے مخصوص اور منفرد اسلوب کی نمائندہ کہانی ہے، جسے انہوں نے استعاروں اور علامتوں کے سہارے بیان کیا ہے۔ یہ کہانی ان کی دوسری کہانیوں سے مختلف زاویے رکھتی ہے۔ اس میں منٹو کا رویہ نہایت جارحانہ، سفاکانہ اور بے رحمانہ دکھائی دیتا ہے، لیکن شاید یہ اس کا رویہ نہیں بلکہ یہ ان کرداروں کی اپنی فطرت ہے جو اخلاقی عناصر سے جداگانہ راستہ بناتے ہیں۔

یہ کہانی ایک ایسے خاندان کے گرد گھوتی ہے جس میں ماں جواں ڈرائیور سے بدی پر اتری ہوئی ہے تو باپ لیڈی سکریٹری سے کھیل کھیل رہا ہے، بھائی نوکرانی سے وابستہ ہے، تو نند، بھاوج اور سہیلی جوان مصور سے تلذذ حاصل کرتی ہیں۔ بقول کمار پاشی ''پھندنے'' میں بدکاروں کا ایک پورا مجمع موجود ہے۔

افسانہ ''پھندنے'' ہمارے ذہن پر تین بنیادی نکات منکشف کرتا ہے۔ ایک واضح پلاٹ کی عدم موجودگی، دوسرا جیتے جاگتے کرداروں کی جگہ ان کے مبہم نشانات یا دھندلکا اور تیسرا مرتعش و منتشر فضا جس کی نشاندہی ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ نکات کی روشنی میں یہ بات تو بہر حال طے ہو جاتی ہے کہ اس کہانی کی بنت انگریزی طرز کی اشاراتی اور علامتی نوعیت کی حامل ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ایک حد تک ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ اس کی تکنیک اردو کی مروجہ کہانیوں کی تکنیک سے بالکل منفرد ہے، کیونکہ اس افسانے میں ہر جگہ علامت، بیان کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہے، اس لیے اگر ہم چاہیں تو اپنی سہولت کے لئے اسے ''علامتی بیانیہ'' کا نام دے سکتے ہیں، حالانکہ منٹو کے معاصر کرشن چندر نے بھی ''غالیچہ'' نام کی کہانی میں کم وبیش اس تکنیک کا استعمال بڑی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری سے انجام دیا ہے، مگر وہاں انداز الگ ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر علامتی کہانیوں کے ایک طویل عرصے میں منٹو کی یہ افسانوی تکنیک متاع بیش بہا کی طرح دریافت کر لی گئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ

سریندر پرکاش اوران کے دیگر معاصرین نے چندایسی عمدہ کہانیاں تخلیق کیں جنھیں آج اردو کہانیوں کا سرمایۂ افتخار تسلیم کیا جاتا ہے۔ نیر مسعوداور منٹو کے تقابل کی کوئی ٹھوس بنیاد ہو یا نہ ہو،لیکن ان کے یہاں منٹو کی اس کہانی کی دھندلکا آمیز فضا کو بنیاد بنانے پر شاید کسی کو کوئی اختلاف نہ ہوگا۔

اس افسانے کی بنیاد جنسی ابتری اور اس سے پیدا ہونے والے اخلاقی زوال، برہنگی، قتل وخون، زنا کاری، نفسیاتی گھٹن، ذہنی انتشار وکرب اوراس کے نتیجے میں طرح طرح کے المیہ سے دوچار ہونے والی زندگی ہے۔اس افسانے میں منٹو نے پہلی بار لفظ کو معنی کے خلاف استعمال کیا ہے۔یہ افسانہ چھوٹے چھوٹے بے ترتیب ٹکڑوں پر مشتمل ہے جن میں الگ الگ تصویریں پیش کی گئی ہیں،لیکن خیال زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ہر تصویر افسانے کو تجربے اور تکنیک کی انتہا تک لے جاتی ہے جس سے کہانی میں آزاد تلازمہ خیال کو پیش کرنے کی شہادت بھی مل جاتی ہے۔افسانے کی تمہید ملاحظہ کیجئے:

’’کوٹھی سے ملحقہ وسیع وعریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلی نے بچے دیئے تھے جو بلا کھا گیا تھا، پھر ایک کتیا نے بچے دیئے جو بڑے بڑے ہوگئے تھے اور جو دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے،ان کو زہر دے دیا گیا تھا۔ایک ایک کرکے سب مرگئے تھے۔ان کی ماں بھی......ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا،وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔‘‘

(منٹو کے نمائندہ افسانے،مرتب اطہر پرویز،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۶ء،ص ۲۶۴)

افسانے کے آغاز ہی سے واقعات کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔اس افسانے میں کوٹھی کے باہر،کوٹھی کے اندر اور جھاڑیوں کے پیچھے کچھ ایسی فضا ہے جس سے گھن آنے لگتی ہے۔کتوں اور بلیوں کے بچے دینے کے واقعات کے ذریعہ بری عادت اور چوری چھپے بدکاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اس کے تمام کردار بے نام ہیں اور ویسے بھی کتے بلیوں کے کوئی نام نہیں ہوتے۔

’’پھندنے‘‘ کا مرکزی کردار کوٹھی کی عورت ہے۔اس کے علاوہ کئی ضمنی کردار بھی ہیں جن کا تانا بانا کہانی سے جڑا ہوا ہے۔اس کہانی کا موضوع ایک ایسا معدوم الاقدار (Valueless) معاشرہ ہے جہاں جنسی بے راہ روی،قتل،خون،زنا کاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ کوٹھی کی وہ عورت ہے جس کی جوانی اُسے بڑھاپے کی دہلیز پر چھوڑ کر رخصت ہوچکی ہے۔وہ اپنا جسم تو ننگا کرچکی ہے،لیکن روح کو بھی ننگا کرنا چاہتی ہے،مگر یہ اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں۔اس کی بے راہ روی کا یہ عالم اس اقتباس میں ملاحظہ کیجئے:

’’وہ اور زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے،مگر اس کی خواہش پوری نہ ہوتی تھی۔ذہین تھی، پڑھی لکھی تھی،جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتی تھی،مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بدعادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔‘‘

(منٹو کے نمائندہ افسانے،مرتب اطہر پرویز،ص ۲۷۰)

منٹو انسانی نفسیات کا ماہر تھا۔جسم کے اتار چڑھاؤ اور عمر میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ آدمی کی سوچ اور فکر میں تبدیلی آجاتی ہے،لیکن انسان کی فطرت میں تبدیلی نہیں آتی۔عورت کی جوانی ضعیفی میں تبدیل ہوچکی ہے،لیکن جنسی بے راہ روی کی فطرت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔وہ اب بھی چاہتی ہے کہ جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔

جنسی اختلاط کے لئے کشش چاہیے۔عورت کو اس بات کا علم ہوچکا ہے کہ اس میں اب وہ کشش باقی نہیں رہی جسے دیکھ کر مرد کے اندر جنسی خواہش انگڑائی لینے لگے۔اسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ آوارہ مزاج عاشقوں کے دلوں میں اس کے لئے اب کوئی جگہ نہیں۔ایسی حالت میں اپنے شباب کو واپس لانے کے لئے اپنے جسم کو کبھی برہنہ کرتی ہے اور کبھی مختلف رنگوں اور زیورات سے آراستہ،لیکن دونوں ہی صورتوں میں وہ ناکام رہتی ہے۔عین وقت پر اسی حالت میں ایک چور منہ پر ڈھاٹا باندھے،ننگا خنجر لئے اندر داخل ہوتا ہے اور عورت کو دیکھتے ہی بدحواس ہوکر بھاگتا ہے۔وہ اسے پکارتی ہے:

''ٹھہرو......ٹھہرو......میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔''

وہ اسے روکنا چاہتی ہے تا کہ اس سے بھی اپنی جنسی خواہش کی تسکین کر سکے، لیکن وہ بھاگ جاتا ہے۔ یہیں عورت کی جنسی بے چینی کا کرب شدت اختیار کر لیتا ہے جسے وہ برداشت نہیں کر پاتی ہے اور اوندھے منھ گر کر جان دے دیتی ہے۔ یہ افسانے کا اختتام بھی ہے اور کلائمکس بھی۔

منٹو نے اس افسانے میں الفاظ اور جملے جس انداز سے تکنیکی سطح پر لایا ہے وہ اپنے حقیقی معنی کھو دیتے ہیں اور جنس، زنا کاری، قتل وتشدد کی علامت کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ایک دن اس کی سہیلی آئی—اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی بلاؤز اتار دی۔ پنکھے کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ اُس کے دودھ اُبلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے...... اِس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ اُبلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ ہل ہل کر گنگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئے......اس سہیلی کا بینڈ بج گیا...... یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی تھی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔'' (منٹو کے نمائندہ افسانے، مرتب اطہر پرویز، ص ۲۶۶)

اس افسانے میں جانوروں کے متعلق ذرا غور کیجئے تو بلیاں اور اس کے بچے ہیں، بلا ہے، کتے اور کتیاں ہیں اور مرغیاں اپنے انڈوں کے ساتھ ہیں۔ افسانے کے شروع میں ہی جنسی تشدد اور قتل کا عمل واضح ہونے لگتا ہے۔ بلی نے بچے دیئے تھے، بلا کھا گیا ہے۔ کتیا نے بچے دیئے، انہیں زہر دے دیا گیا۔ کتیا بھی مرگئی۔ کتا کہیں غائب ہو گیا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی، پھر نہ جانے دلہن کو کیا سوجھی اس نے جھاڑی کے بجائے بستر پر بچہ دیا جو بڑا گل گوتھنا لال پھندنا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو مار ڈالا۔ باغ میں بلے گھومتے ہیں جو اسے چھیچھڑوں کی ٹوکری سمجھتے تھے، حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔ نارنگیاں چھوٹی چھوٹی تھیں پھر دیکھتے دیکھتے بڑی ہو گئیں۔ اب وہ فرش پر لڑھکتی ہیں۔

افسانے میں چاہے آملیٹ کے داغ ہوں یا بلاؤز اتارنے کا معاملہ یا دودھ ابلنے کا عمل یا تیز بخار آنے کا قصہ یا ڈرائیونگ سیکھتی ہوئی عورت یا کسی ڈرائیور کا عورت کے بدن سے موبل آئل پوچھنے کا عمل، یہ ساری صورتیں جنسی خواہشات کا نتیجہ ہیں۔ انسان کی ہر حرکت میں جنسی فعل ہوتا ہے۔ منٹو نے بڑی فنکاری کے ساتھ اس افسانے میں استعاروں اور علامتوں کو اس طرح سجایا ہے کہ ہر علامت جنسی عمل کی تصویر بن گئی ہے۔

فن کار اپنے نقطہ نظر کی وضاحت چاہتا ہے اس لئے موضوع کی مناسبت سے کردار کی صفت کو نمایاں کرنے کے لئے منظر نگاری سے کام لیتا ہے، لیکن زیر بحث کہانی میں فضا پوری طرح واضح نہیں بلکہ یہ فضا ابر رواں کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ عورت اس کہانی کا بنیادی نکتہ ہے۔ یہی نکتہ علامت کی شش جہات بن جاتا ہے۔ زمان ومکان کا جو روایتی تصور ہے اگر اس کہانی میں تلاش کیا جائے تو ہمیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑیں گی، لیکن اس عورت کے تمام خصائل کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو اس میں زمان ومکان کی صورتیں بہر کیف پنہاں دکھائی دیتی ہیں۔ جوانی سے پیری کا بیان ماضی وحال کے زمانی اور مکانی دعوے پر ایک مضبوط استدلال ہے۔ منٹو نے ''پھندنے'' میں پھر اپنی جدت اور ذہانت کا ثبوت بھی دیا ہے۔ وہ اس افسانے میں نہ ہی زمان ومکان کا سہارا لیتا ہے اور نہ ہی قدرتی مناظر کا بلکہ وہ عورت کے جسم سے ہی ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ عورت خود جنس کا منظر بن جاتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں:

''اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں سمتیں پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف قسم کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہٹ جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری کا پردہ، عقب میں چلے جاؤ تو کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر...... ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو ٹماٹو ساس سے بھرا ہوا مرتبان۔''

(منٹو کے نمائندہ افسانے، مرتب اطہر پرویز، ص ۲۶۹)

اس افسانے میں ایک طرف حقیقت اور خواب ہم آہنگ ہوتے نظر

(بقیہ ص ۳۸ پر)

سلطان آزاد

"Ashiana-e-Sultan" Pannu Lane, Gulzarbagh, Patna 800007 (Mob. 8789934730)

شوکت حیات: ایک انفراد بداماں فنکار

عام طور سے اُردو کے دو ادبی اسکول کا ذکر آتا ہے۔ یعنی دبستانِ دہلی اور لکھنؤ، حالانکہ دہلی اُجڑی تو دہلی سے ہجرت کرنے والوں کی جائے پناہ عظیم آباد، مرشد آباد اور لکھنؤ ہوئی۔ ان میں سے بیشتر ارباب کمال عظیم آباد کے ہو کر رہ گئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

عظیم آباد اردو ادب کا ایک اہم دبستان رہا ہے۔ اس کی قدامت اور اولیت مسلم ہے۔ اردو شاعری کے علاوہ تحقیق وتنقید کے حوالے سے بھی اس دبستان کی دیرینہ عظمت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جہاں تک اردو میں تخلیقی نثر کا سوال ہے تو افسانہ، ناول، ڈراما، خاکہ اور انشائیہ وغیرہ میں بھی دبستان عظیم آباد اپنی خصوصی شناخت رکھتا ہے۔ اردو افسانہ اور ناول کی دھوم پوری اردو دنیا میں اسی دبستان کے حوالے سے ہے۔ یہاں اپنی خصوصی شناخت رکھنے والوں میں اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، سید محمد محسن، شکیلہ اختر، احمد یوسف، عبدالصمد، شفیع جاوید، شبیر احمد، رضوان احمد، شمیم صادقہ، شہناز فاطمی، شوکت حیات اور مشرف عالم ذوقی وغیرہ کے اسمائے گرامی مشہور زمانہ ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنی گوناگوں خدمات کی وجہ سے اردو فکشن میں اپنی قابلیت، فنکاری، ہنرمندی اور شہرت وعظمت کے پرچم بلند کئے ان میں شوکت حیات کی اہمیت و عظمت یقیناً اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور منفرد تھی۔

شوکت حیات ابن سید محفوظ الحق، یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو پٹنہ سٹی (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آئی۔ ایس۔ سی اور بی۔ ایس۔ سی کی تعلیم مکمل کی، پھر کافی عرصہ بعد اردو میں ایم۔ اے کیا۔ تحریر کا شوق انہیں مدتوں سے تھا۔ اسی شوق نے ان کو افسانہ نگاری کی طرف راغب کیا۔ دوران طالب علمی نکسلی تحریک سے وابستگی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ کمیونسٹ ذہن کا عکس ان کی تحریروں، بالخصوص افسانے پر جا بجا رہا۔ ان کی پہلی کہانی ''بکسوں سے دبا آدمی''، ''کتاب''، لکھنؤ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ چالیس برسوں تک مسلسل چھپنے کے بعد لوگوں کے اصرار پر ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۰ء میں اور ۲۰۱۲ء میں بارہ مضامین کا مجموعہ ''بانگ'' شائع ہوا۔ اگرچہ ان کے تین افسانوی مجموعے ''بھوبل''، ''پھیسنڈا'' اور ''رانی باغ'' تیار تھے۔ علاوہ ازیں ایک ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' اور ایک مجموعہ مضامین ''۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانہ'' بھی تیار تھا، لیکن ان کی زندگی میں اشاعت کے مرحلے سے نہیں گزر سکا۔

اردو فکشن کی تنقید پر بھی شوکت حیات کی گہری نظر تھی۔ دانشوران علم وادب ان کی عالمانہ فکشن تنقید کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کے بیشتر فکشن سمینار و مذاکرے میں ان کی شرکت ہوتی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد شائع ہونے والے اہم افسانوں کی انتھولوجی میں ان کی کہانی شامل کی گئی اور ساہتیہ اکیڈمی دہلی کے گرانٹ پر ہندوستان کے مختلف ثقافتی علاقوں کی انہوں نے سیاحت کی۔ مختلف اکیڈمیوں سے انعامات و اعزازات بھی انہیں حاصل ہوئے۔ ۱۹۷۱ء کے رسالہ ''آہنگ'' گیا ش ۲۱-۲۲ میں شوکت حیات پر خصوصی گوشہ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ رسالہ ''تکمیل'' بھیونڈی میں بھی ''گوشۂ شوکت حیات'' شائع ہوا تھا۔ رسالہ ''ثالث'' مونگیر (جنوری تا جون ۲۰۲۱ء) نے بھی مکمل شوکت حیات نمبر نکالا۔

۱۹۸۰-۸۱ء میں اپنی کتاب ''دبستان عظیم آباد'' کی تیاری کے سلسلے میں شوکت حیات سے ان کے دفتر بسکومان، پٹنہ میں میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ انہوں نے ہر ملاقات میں میری تواضع تو کی، لیکن ہر بار اپنی سوانح دینے میں ٹال مٹول کرتے رہے۔ میں ان کی رہائش گاہ ''مہابیر لاج'' نزد ملیریا آفس، پٹنہ بھی کئی بار گیا، لیکن ناکام رہا۔

بالآخر میں نے اپنی کتاب میں اپنے طور سے ان کا مختصر تذکرہ درج کر دیا۔ کتاب منظر عام پر آئی تو اسے دیکھ کر مجھ سے مسکرا کر اور جھینپ کر بولے:

''بھئی میں آپ کو اپنی سوانح نہ دے سکا، لیکن آپ نے میرا تذکرہ بحیثیت افسانہ نگار شامل کیا ہے اس لئے بہت بہت شکریہ! جو بھی اس تذکرہ میں کمی رہ گئی اس میں میری تساہلی رہی، لہٰذا میں اس کا خود ذمہ دار ہوں۔''

شوکت حیات نہایت اخلاق مند اور معصوم طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ پل میں اگر کسی سے غصہ ہوتے تو دوسرے موقع پر اسے گلے لگا لیتے تھے۔ اپنے دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے۔ کئی برسوں بعد جب ان کا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' منظر عام پر آیا تو اس کی ایک جلد مجھے بھی عنایت کی اور اس کتاب کے سادہ صفحہ پر لکھا:

''پیارے بھائی سلطان آزاد کے لئے خلوص کے ساتھ برائے تبصرہ، تجزیہ وتنقید۔'' (شوکت حیات، ۱۲ فروری ۲۰۱۲ء)

مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' میں پچیس کہانیاں شامل ہیں۔ تین ناقدین ادب وارث علوی (شوکت حیات کی افسانہ نگاری) مہدی جعفر (شوکت حیات کا فنی سفر) اور ڈاکٹر ابرار رحمانی (شوکت حیات کے افسانے) کے مضامین اور شوکت حیات کے مضمون ''میری تھیوری سازی اور میرے افسانے'' کے علاوہ دوسرے دانشوران علم وادب کی آرا کے تحت گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، وہاب اشرفی، نظام صدیقی، دیویندر اسر، ڈاکٹر نورالحسن نقوی، مظہر امام، حامدی کاشمیری، شہنشاہ مرزا، زبیر رضوی، ڈاکٹر نکہت ریحانہ خان، کمار پاشی، طارق سعید اور جوگندر پال وغیرہ کی مختصر تحریریں شامل ہیں۔

شوکت حیات، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے الگ اپنی ایک نئی تھیوری ''انامیت'' کا خود کو بنیاد گزار مانتے ہیں۔ مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' کے پہلے صفحہ پر وہ یوں رقم طراز ہیں:

''غیر روایتی، غیر ترقی پسند، غیر جدید، غیر مابعد جدید افسانے جنہوں نے 'انامیت'، 'نامیاتیت' اور سارک رائٹرس کانفرنس ۲۰۰۵ء علی گڑھ کے موقع پر 'امکانیت پسندی' کی تھیوریز دیتے ہوئے انام افسانے، نامیاتی افسانے اور امکانی افسانوں کی بنیاد گزاری کی ہے اور ان کے خدوخال متشکل کرتے ہوئے عصری و آفاقی افسانوں کی تخلیق کی ہے۔''

شوکت حیات کو ان کی علمی سندی تعلیم کے اعتبار سے ملازمت نہیں ملی۔ انہیں اسٹیٹ کوآپریٹو مارکیٹنگ یونین میں ملازمت ملی، لیکن بسکومان کی مالی بدحالی کے سبب انہوں نے قبل از وقت ملازمت چھوڑ دی جس کے باعث معاشی بدحالی اور گھریلو مسائل سے دوچار رہے۔ ایسے حالات میں ان کے اندر جھنجھلاہٹ اور دماغی الجھنوں نے جگہ لے لی تھی، لیکن بہت جلد وہ اپنی دنیا یعنی فکشن کی دنیا میں آباد ہوگئے۔ اگرچہ وہ ان حالات میں بھی اپنے مطالعہ ومشاہدہ سے سیاسی، معاشرتی تبدیلیوں پر اپنے افسانوں سے احتجاج کرتے رہے۔ ان کی احتجاجی کاوشوں اور اور ان کے رویوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی رقمطراز ہیں:

''شوکت حیات، امن وآشتی کی جلاوطنی اور خوبصورتی و روشنی کی قفل بندی پر پرزور احتجاج کرتے ہیں۔ بہتر دنیا، بہتر معاشرہ اور بہتر انسانوں کی جستجو ان کے آؤٹ لک کا خصوصی خاصہ ہے، اس لئے وہ اس تلاش کو اپنے فن کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ وہ ناہمواریوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے صرف گلہ نہیں کرتے بلکہ ان سے ہمہ وقت ٹکرانے کو تیار بھی رہتے ہیں۔'' (بحوالہ: شوکت حیات کا افسانوی اختصاص، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، شوکت حیات نمبر، رسالہ 'ثالث' مونگیر، جنوری تا جون ۲۰۲۲ء، ص ۷۱)

سماجی وسیاسی استحصال پر کئی افسانہ نگاروں نے اپنی اپنی آوازیں بلند کی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ شوکت حیات زیادہ نمایاں نظر آتے

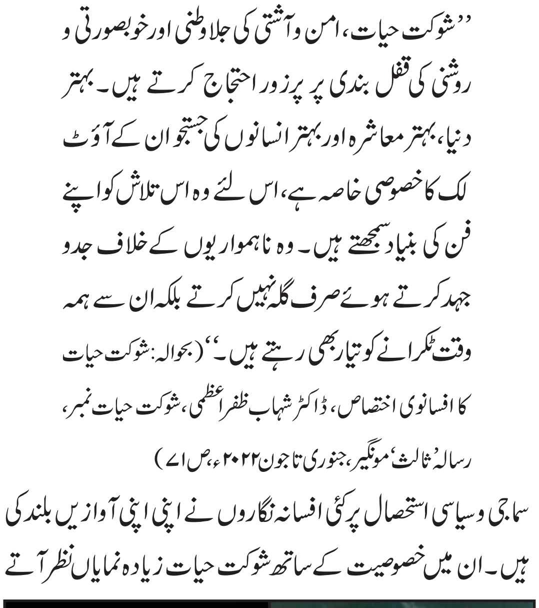

ہیں۔ احتجاج کی صورتیں شوکت حیات کے بیشتر افسانوں میں موجود رہی ہیں جو احتجاج کی عمومی صورتوں سے الگ ہیں۔ وہ ناہمواریوں کے خلاف نہ صرف احتجاج کرتے ہیں بلکہ ان سے ہمہ وقت ٹکرانے کو بھی تیار رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر ناقدین فکشن نے انہیں Protest فنکار کہا ہے۔ شوکت حیات کی ذہنی اُپج کو محسوس کرتے ہوئے سماجی و سیاسی استحصال کے خلاف ان کے احتجاج کو قمر رئیس یوں بیان کرتے ہیں:

''ان کا خیال ہے کہ آج کی نسل کے پاس سیاسی شعور تو ہے۔ وہ سماج کے مسائل پر لکھ بھی رہی ہے۔ لیکن اپنے آپ کو کسی مخصوص نظریہ سے وابستہ نہیں کرنا چاہتی...... وہ اپنے آپ کو حقیقت پسند اور Radical Free Think کہتے ہیں۔ وہ خواہ کتنا بھی کہیں کہ وہ روایتی ترقی پسند ہیں نہ جدید، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی کہانیاں آج کے عہد کا احتجاجی و انقلابی اشاریہ ہیں۔'' (بحوالہ: ترقی پسند ادب کے معمار، مرتب قمر رئیس، ص ۳۲۵ و ص ۳۲۶)

شوکت حیات نے سو سے ڈیڑھ سو افسانے لکھے جو شائع ہو کر قارئین و ناقدین تک پہنچے اور پسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھے گئے۔ ان افسانوں میں ''کوبر''، ''گھونسلا''، ''اپنا گوشت''، ''رانی باغ''، ''سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ''، ''ڈھلان پر رُکے ہوئے قدم''، ''بھائی''، ''سرخ اپارٹمنٹ''، ''بانگ''، ''فرشتے''، ''بلی کا بچہ''، ''کوا'' اور ''گنبد کے کبوتر'' وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر اور لائق تحسین ہیں۔

''گنبد کے کبوتر'' شوکت حیات کا وہ افسانہ ہے جس سے ان کی خصوصی شناخت ہوئی۔ یہ افسانہ بابری مسجد کے انہدام سے متعلق ہے۔ اگر چہ اس موضوع پر دیگر افسانہ نگاروں کے افسانے منظر عام پر آئے ہیں، خصوصی طور پر سید محمد اشرف کے افسانہ ''دوسرا بن باس'' اور زاہدہ حنا کا افسانہ ''منزل ہے کہاں تیری'' زیادہ قابل اعتنا سمجھا گیا، لیکن شوکت حیات کا افسانہ ''گنبد کے کبوتر'' اپنی انفرادیت کے باعث ان سب پر سبقت لے گیا۔ اس افسانہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''بے ٹھکانہ کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔ متواتر اڑتا جا رہا تھا۔ اوپر سے نیچے آتا۔ بیتابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اڑ جاتا۔''

اور پھر اس کا اختتام ان سوگوار جملوں پر ہوتا ہے:

''آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے اماں کی تلاش اور کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکر کاٹ رہا تھا...... بیوی سے اس کی نگاہیں ملیں تو اسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میت پڑی ہے اور باہر کرفیو میں اس کی تدوین ایک سنگین مسئلہ ہے۔''

اس افسانہ کی معنویت کا اظہار وارث علوی کچھ یوں کرتے ہیں:

''گنبد جب تک تھا، علامت تھا، ہماری تاریخ، تہذیب اور مذہب کی۔ اب نہیں رہا تو ایسا روحانی خلا پیدا ہو چکا ہے، جس کی ماہیت کا بھی ہمیں شعور نہیں۔ اس خلا میں ان کبوتروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز گونجتی ہے، جو گنبد کے نہ ہونے سے بے سہارا ہو گئے ہیں۔ کبوتروں سے قطع نظر آدمی کا بے سہارا پن ایسے دور دراز اندیشوں کو جنم دیتا ہے کہ وقت کے بہاؤ میں اس کی شکستہ کشتی کو کوئی کنارہ مل سکے گا یا نہیں یا پھر یہ ہولناک انجام کا آغاز ہے۔'' (بحوالہ: شوکت حیات کی افسانہ نگاری، مشمولہ شوکت حیات نمبر، رسالہ ثالث، مونگیر ۲۰۲۲ء، ص ۲۲)

غرض یہ کہ شوکت حیات کے افسانوں میں نئے تجربات اور اجتہادات تو ملتے ہیں، لیکن ان کے یہاں ایک ہی رنگ کے افسانے نہیں، بلکہ ان کے افسانوں میں موضوع اور طرز بیان میں کافی تنوع ہے۔ وہ اردگرد کی زندگی کا مشاہدہ گہرائی اور باریکی سے کرتے ہیں اور زندگی سے متعلق ہر مسئلے پر غور و فکر کرتے ہوئے اسے اپنے افسانے کا حصہ بناتے ہیں۔ یہ افسانے عام انداز یعنی سیدھے سادے واقعہ کی شکل میں سامنے نہیں آتے بلکہ ان کی فنی گرفت انہیں بڑی خوبی سے ادبی تخلیق کی شکل دے دیتی ہے اور وہ اپنی رمزیت، ایمائیت، اشاریت اور تہہ داری کے سبب عام بیانیہ افسانوں سے مختلف اور منفرد کہلانے کا حق پا لیتے ہیں۔

(بقیہ ص ۴۷ پر)

ڈاکٹر محمد ثاقب انور
Sarweli, Post. Baraidgah, Via. Kasba, Purnia - 854330 (Mob. 9801261623)

معین الدین دردائی: حیات ونگارشات

یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف صیغہ ہائے حیات میں انسان اپنے اخلاق وکرداراور اپنے مفید خلائق کارناموں سے عمر دوام پاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اُسے زندگی اور زمانے کے جبر سے دائمی نجات کبھی نہیں ملتی اور تمام تر عظمت وشہرت کے باوجود اُسے جیتے جی طالع آزمائی کے دور سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اتنی ہی ناموری اور بزرگی اُسے نصیب ہو پاتی ہے جواس کے لئے مقدر رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض شخصیتیں بے پناہ علمی برتری اور پذیرائی کے باوجود خاطر خواہ شہرت سے محروم رہ جاتی ہیں اور آسودۂ لحد ہونے کے بعد، بہت جلد اُن کا نام بھولے بسرے ناموں کی فہرست میں آجاتا ہے۔

معین الدین دردائی کا نام، بیسویں صدی کے حوالے سے بہار میں تحقیق وتذکرہ نگاری کی مہتم بالشان روایت کا ایک ایسا ہی نام ہے۔ پروفیسر دردائی کی علمی خدمتوں کا مرتبہ مسلم، لیکن ان کی یادیں بہرصورت بہت ہی مدھم ہوچکی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تقسیم وطن کا وہ زمانہ پایا جو ہجرت در ہجرت کا کرب اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ کچھ تو وہ کمزور صحت کے آدمی تھے اور بار بار بیماری کے حملہ سے صاحب فراش ہوتے رہے، کچھ یہ کہ اُن کے لئے تادیر کسی ایک جگہ مستقل ملازمت کی سبیل بدقت تمام ہی نکل سکی اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ وہ بہ سلسلہ ملازمت اوّلاً مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں رہے اور پھر وہاں سے خرابی صحت کے باعث اپنے آبائی وطن بہار شریف واپسی کے بعد بالآخر مستقل طور پر مغربی پاکستان جانے کا فیصلہ انہیں عملاً قبول کرنا پڑا۔

پروفیسر معین الدین دردائی کے بارے میں سوانحی معلومات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا پورا نام محمد معین الدین ابن حکیم سراج الدین تھا، وہ اپنے آبائی وطن موضع سرتھوا، اسلامپور ضلع نالندہ میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے، لیکن ان کے سال ولادت میں تھوڑا سا اختلاف بھی ہے۔

پروفیسر دردائی کا تعلق ایک صوفی اور صاحب ورع خاندان سے تھا۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں ''ندوۃ العلما''، لکھنؤ میں داخل کیا گیا، لیکن معاشی دقتوں کے باعث وہ جلد ہی وہاں سے لوٹ آئے اور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں زیر تعلیم رہے اور پھر مدرسہ کی تعلیم ترک کر کے ۱۹۲۸ء سے عصری انگریزی تعلیم کی طرف آگئے اور ۱۹۳۲ء میں پٹنہ ہی سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رُخ کیا اور انٹرمیڈیٹ کے بعد وہیں سے اردو آنرز اور اردو ایم اے کی سند لی۔ یہ ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء کے زمانے کی بات ہے اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں انہیں ذی استعداد، نامور اور نہایت ہی شفیق اساتذہ کی خصوصی توجہ مل گئی۔

معین الدین دردائی ثانوی تعلیم کے زمانے سے ہی مضمون نویسی کی طرف مائل تھے، ۱۹۳۱ء میں ان کا مضمون ''عورت سے خطاب'' اور ''عورت کا جواب'' گیا کے مشہور رسالہ ''ندیم'' میں چھپ چکا تھا۔ علی گڈھ کے ابتدائی تعلیمی دور میں احقر بہاری پر جب ان کا مضمون ''معارف'' ۴نومبر ۱۹۴۴ء کی زینت بنا تو اس نے اُن کے پارکھی اساتذہ کو بروقت، اُن میں چھپے جوہر کا تازہ احساس دلایا، یہاں تک کہ ''دکن کے قدیم مثنوی گوشعرا'' اور ''تذکرۃ الشعرا'' پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے انہیں حیدرآباد، بھوپال، ممبئی اور کئی دوسرے شہروں میں بھیجا گیا، تاکہ وہاں کے کتب خانوں سے اپنے موضوع کے مطابق استفادہ کرسکیں۔

دردائی کا ایک اہم تحقیقی مضمون ''حیدرآباد کے کتب خانوں میں اردو کی بعض قلمی مثنویاں'' اسی زمانے کی یادگار ہے، جسے قاضی عبدالودود نے اپنے رسالہ ''معیار'' مئی ۱۹۳۶ء کے شمارے میں شائع

کیا تھا اور کم وبیش یہی وہ زمانہ ہے جب معین الدین دردائی کو ''علی گڈھ میگزین'' کی ادارت کا موقع بھی ملا اور وہ ''انجمن حدیقة الشعرا'' کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے۔

ظاہر ہے کہ دردائی اپنے دور کے بہت ہی ہونہار، ذہین، محنتی اور ذی صلاحیت طالب علم ہونے کی وجہ سے، جیسا کہ اشارہ ہو چکا، اپنے اساتذہ کی توجہ کے ہمہ دم مرکز بنے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کی سند لینے کے بعد مولوی عبدالحق نے انہیں ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ''انجمن ترقی اردو ہند'' میں دہلی بلا لیا، جہاں ''ہندوستانی ڈکشنری'' مرتب کرنے کے کام میں ۱۹۴۲ء تک انہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شاگردی اور علمی سرپرستی حاصل رہی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب دردائی متاہل زندگی میں آئے۔ان کی نصف بہتر کا وطنی تعلق محلّہ چودھرانہ آرہ سے تھا، مگر افسوس کہ جہاں ایک طرف ان کی علمی ترقیات اور مشغولیات کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلتے رہے اور ان کی زندگی کے خوبصورت زمانے کی ابتدا ہوئی، وہیں دوسری طرف ان کی صحت نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا جو ان کے لئے سخت معاشی پریشانی کا باعث بھی ہوا، یہاں تک کہ اس دور میں انہوں نے کسب معاش کے لئے کرانے کی دوکان کھول کر، اپنے وطن ہی میں رہتے ہوئے تجارت کی طرف آنا چاہا، مگر ظاہر ہے کہ اس معاشی شغل اور ان کے علمی مزاج و مذاق میں جو بعد مشرقین تھا، اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ایسے حالات و معاملات میں ہوا کرتا ہے۔

خیر سے چند سال بعد ۱۹۴۵ء میں گیا کالج میں انہیں عارضی طور پر اردو لکچرر کی جگہ مل گئی اور وہ تجارت کی دنیا سے تدریس کی دنیا میں لوٹ آئے اور اس لئے بھی ایک لحاظ سے مزید کامیاب رہے کہ اس دوران انہوں نے ۱۹۴۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی ایم۔اے کی سند بھی لے لی، لیکن یہ حالات کا جبر ہی تھا کہ اُن دنوں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں بہار کا بڑا حصہ جل رہا تھا، چنانچہ اس سے وحشت زدہ ہو کر انہوں نے کلکتہ کی رواہ لی اور وہاں کے کسی اسکول میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن وہاں بھی بہت جلد صحت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ اپنے وطن لوٹ آئے اور کوسی کالج کھگڑیا میں بحیثیت لکچرر برسر کار ہوئے، مگر یہ مصروفیت بھی مختصر ہی رہی اور وطن کی تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے ایڈورڈ کالج میں شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے اپنا عہدہ سنبھالا اور انہیں بنگلہ زبان سیکھنے کا بھی موقع ملا۔اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی کتاب ''جلوے'' میں تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ ملازمت انہیں مولوی عبدالحق کی وساطت سے ملی تھی اور اس ملازمت کے دوران انہوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان کی ایما پر اردو بنگلہ لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا اور ''بنگلہ زبان وادب کی تاریخ'' پر بھی وہ ضروری مواد یکجا کر رہے تھے۔ وہاں انہوں نے مطبع اور ''دارالاشاعت'' بھی قائم کیا تھا، لیکن جون ۱۹۵۰ء میں بیماری کے تازہ اور سخت حملہ نے انہیں ایک بار پھر پردیس چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وطن آ کر لمبی مدت تک وہ ذی فراش رہے۔ پروفیسر دردائی نے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے بہت ہی درد بھرے لہجہ میں لکھا ہے کہ:

> ''میں ایک حرماں نصیب اور ناکام انسان ہوں اور میری اس حرماں نصیبی کو میری غیر مستقل مزاجی نے اور بھی دوچند کر دیا۔میری غیر مستقل مزاجی کا سب سے بڑا سبب میری

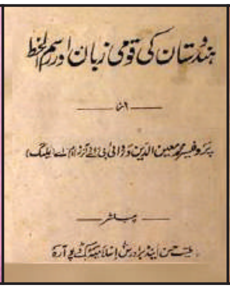

آرزوؤں کا ہجوم ہے۔ میری صلاحیتیں میری آرزوؤں
اور حوصلوں کا ساتھ نہیں دیتیں اور جھنجھلا کر میں اپنی راہ
عمل بدلتا رہا، لیکن نتیجہ میں کامیابی پر مزید ناکامیابی کا
اضافہ ہوتا رہا۔'' (جلوے، ص ۹۵)

معین الدین دردائی کا مذکورہ بالا بیان یقیناً اظہار جذبات سے خالی نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ تقسیم کے بعد بہر حال سرحد پار کی ہجرت کا یک گونہ فیصلہ لے چکے تھے، اس کا اندازہ یوں ہوتا ہے، وہ اپنے صاحبزادوں کے ساتھ وہاں گئے تھے مختصر یہ کہ بیماری سے افاقہ کے بعد وہ پھر مستقل طور پر سرحد پار چلے گئے اور ۱۴/اپریل ۱۹۷۹ء کو وہیں ان کی وفات ہوئی اور کراچی میں آسودۂ لحد ہوئے۔

معین الدین دردائی خاندانی اعتبار سے بڑا اشرف و مجد رکھتے تھے۔ ''مہر نیم روز'' کراچی کے ''اختر اورینوی نمبر'' میں ان کا جو تعارف نامہ چھپا ہے، اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے نام کا لاحقہ ''دردائی'' صحابی حضرت ابودردا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت سے ہے۔ مزید اُن کے سوانح نگاروں نے یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے خاندان سے بھی وہ نسبت رکھتے تھے۔ اگرچہ صحت کے اعتبار سے وہ دائمی مریض رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علمی صلاحیت اور ذہانت و لیاقت کے اعتبار سے وہ بڑے اونچے مقام پر فائز تھے اور ان کی علمی سرگرمیاں بھی مسلسل علالت کے باوجود ہمیشہ جاری رہیں۔

پروفیسر معین الدین دردائی کی تصنیفی زندگی کا آغاز ۱۹۴۷ء سے ہوا اور تین دہائی تک یا یوں کہا جائے کہ اُن کے آخری زمانہ حیات تک جاری رہا۔ ''بہار اور اردو شاعری'' ان کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اشاعت یافتہ اس کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے پروفیسر اختر اورینوی نے ان کے اس کارنامے کو صفیر بلگرامی اور امداد امام اثر کے کارناموں سے فراتر قرار دیا ہے اور یقیناً اس کتاب کی ترتیب، اس کے مواد اور اس میں استعمال ہونے والے طریق کار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اختر اورینوی کی باتوں میں ایک قسم کے تجزیاتی وزن و وقار کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے معین الدین دردائی کو دیکھا تھا، وہ معین الدین دردائی جو اس وقت تقریباً پچیس سال کے تھے اور انہیں کے لفظوں میں:

''ایک متین، سنجیدہ، باوضع اور چمکیلی آنکھوں والی شخصیت
(کے مالک) درمیانہ قد، صندلی رنگ، جاذب توجہ انداز و
رفتار اور پرتاثیر گفتگو، متانت کے ساتھ مسکراتا ہوا چہرہ،
ہمدرد آنکھیں اور بہت سی ایسی بے نام کیفیتیں جن سے
بہر حال اخلاص کا اظہار ہوتا تھا۔'' (بہار میں اردو شاعری، صفحہ د)

پروفیسر معین الدین دردائی کی دوسری مشہور کتاب ''ہندوستان کی قومی زبان اور اردو رسم الخط'' بھی ۱۹۴۷ء کی اشاعت یافتہ ہے۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے ''ہندوستان کی اُس پرعظمت زبان کے نام'' کیا ہے ''جسے ہندو مسلمان دونوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔'' مذکورہ کتاب کی اِن انتسابی سطروں سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ لسانی عصبیت کے نظریہ سے کوسوں دور تھے اور زبان کے بارے میں ان کے اسی میلان کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اردو کو ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط تسلیم کئے جانے کا مشورہ دینا اپنی عصری ذمہ داری سمجھا اور اپنی کتاب میں حتی الوسع اس مشاورت کے اہم اور مفید پہلو دلائل و براہین سے روشن کرنے کی سعی میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ اس کتاب کا تعارف پروفیسر احمد حسن کے قلم سے ہے۔

مذکورہ دونوں کتابوں کے علاوہ ان کے تاثراتی مضامین یا خاکوں کا مجموعہ ''جلوے'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اشاعت

یافتہ اس مجموعہ میں بارہ تاثراتی تحریریں یا بارہ شخصیات کے خاکے ہیں جن کا تعلق دردائی کے اساتذہ، معاصرین اور ہم جماعت شخصیتوں سے ہے۔ اس میں ایک مضمون پروفیسر دردائی نے اپنے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ''جلوے'' کے تبصرے ماہنامہ ''سہیل'' میں چھپتے رہے تھے۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے چند اقتباسات دیکھتے چلیں:

''سرخی مائل گورا رنگ، پستہ قد، چھریرا بدن، چھوٹی ناک، مضطرب چمکتی ہوئی آنکھیں، مونچھ داڑھی دونوں سے بے نیاز۔ پچاس کے لگ بھگ سن —— آپ ہی ہیں جناب آل احمد سرور، ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی۔ بی ایس سی کر کے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے لئے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ایم اے (انگریزی) میں فرسٹ کلاس ہوئے، پھر اردو ادب میں ایم اے کیا اور اس میں بھی فرسٹ کلاس آئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کو شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے بلالیا۔ کچھ دنوں تک وہاں رہنے کے بعد رام پور کالج میں پرنسپل ہو کر چلے گئے، پھر وہاں سے لکھنؤ یونیورسٹی میں بلا لئے گئے اور آج کل وہاں شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور اس وقت اردو ادب میں ایک نقاد، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ سرور صاحب کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور مسکینیت پائی جاتی ہے، لیکن ان میں علم کا غرور اور علمیت کا احساس کافی پایا جاتا ہے۔ وہ دیر آشنا اور مہذب ہیں اور بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے ہیں۔''

(ماہنامہ ''سہیل''، جون ۱۹۵۴ء)

گورا رنگ، لانبا قد، چھریرا بدن، ستواں ناک، بلند پیشانی، چمکتی ہوئی آنکھیں، خوبصورت خدوخال، پینتالیس کے لگ بھگ سن —— آپ ہیں پروفیسر اختر اورینوی، اردو ادب کے ممتاز ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور نقاد۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے وہیں سنیئر لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور اس وقت نہ صرف صوبہ بہار اور ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اردو دنیا میں اپنا مخصوص اور بلند مقام رکھتے ہیں۔ اختر صاحب خوش پوشاک اور وضع دار انسان ہیں۔ باتیں دلکش انداز میں کرتے ہیں اور کافی رکھ رکھاؤ سے ملتے ہیں۔ ملنے اور بات چیت کرنے میں بہت زیادہ خلوص معلوم ہوتا ہے۔ تقریر بھی کرتے ہیں اور اچھی کرتے ہیں۔ ایک معلم کی حیثیت سے بھی وہ بہت زیادہ کامیاب اور مقبول ہیں۔ طلبا ان کی علمیت اور لکچر کی دل سے قدر کرتے ہیں اور یہ آج کل بہت کم اساتذہ کو نصیب ہے۔ اختر صاحب ایک وقت میں افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، نقاد اور شاعر سب کچھ ہیں اور مجھے ان کی یہی بڑی کمزوری معلوم ہوتی ہے۔ ان کی حوصلہ مندی نے ان سے ہر صنف پر قلم اٹھوایا، لیکن ظاہر ہے کہ ہر صنف ادب پر قلم اٹھانے والا کسی میں بھی کامل نہیں ہوسکتا، ورنہ اختر صاحب کی غیر معمولی صلاحیتیں اس لائق تھیں کہ وہ ادب کی کسی ایک دو صنف پر امتیاز اور کمال کا درجہ حاصل کرتے۔ وہ بہ یک وقت نقاد بھی ہیں اور افسانہ نویس بھی۔ علمی دقیق مسئلوں پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اور ڈرامہ بھی لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے چار اور تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔''

(ماہنامہ ''سہیل''، مئی ۱۹۵۴ء)

سانولا رنگ، گداز بدن، پستہ قد، بلند پیشانی، چمکتی ہوئی آنکھیں، سنجیدہ چہرہ —— آپ ہیں قاضی عبدالودود صاحب (بی اے، کینٹب) بار ایٹ لا، اردو کے مستند اور بلند پایہ محقق۔ آپ صوبہ بہار کے ایک متمول اور باوقار خانوادہ کے فرد ہیں۔ عرصہ تک یورپ میں تعلیمی تکمیل کے لئے رہے، لیکن وہاں زیادہ تر اپنا وقت اردو ادب کی

تحقیقات اور وہاں کے مشہور کتب خانوں سے استفادہ میں صرف کرتے رہے اور نتیجہ میں 'تذکرۂ جوشش' وغیرہ جیسی مستند کتاب کو پیش کر کے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ قاضی صاحب لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آئے، لیکن ادبی انہماک نے اور زیادہ تر گھر کے تمول نے ان کو حصول معاش کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا اور اب تک وہ برابر علم و ادب کی خدمت ہی میں اپنا وقت صرف کرتے رہتے ہیں۔ قاضی صاحب کی طبیعت بڑی چڑچڑی اور خود پسند واقع ہوئی ہے۔ ان کا خیال اپنے متعلق بہت بلند ہے اور ان کی ادبی اور علمی اَنانیت نے غرور کی حد تک ان میں بدنمائی پیدا کر دی ہے۔ ان کی بارگاہ میں اپنی خودداری کو پامال کئے بغیر کسی کی باریابی ناممکن ہے۔ ان کی اس طبیعت نے مومنؔ کی طرح ان کے معاصرین اور احباب کو ان سے اجتناب اور احتیاط کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان کی لیاقت علمی کا اعتراف اکثر و بیشتر کو ہے، لیکن ان کی خود پرستی، ضد اور انانیت کے باعث بہت کم لوگ ان سے مل کر استفادہ کر سکتے ہیں۔'' (ماہنامہ ''سہیل'' اپریل ۱۹۵۴ء)

پروفیسر معین الدین دردائی کے قلم سے شخصیتوں کے یہ ''جلوے'' اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے اُن شخصیتوں کو جس طرح دیکھا ہے اور پایا ہے، اسی طرح اپنے پڑھنے والوں کو دکھا دیا ہے اور نہایت بے تکلفی اور سادگی سے ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

یہ تحریریں بتا رہی ہیں کہ خاکہ نگاری میں وہ زبردست ملکہ رکھتے ہیں۔ یہاں ''گلی از گلزار'' کے مصداق آل احمد سرور، اختر اور ینوی اور قاضی عبدالودود پر اُن کے لکھے ہوئے خاکوں سے جو اقتباس شامل ہوا ہے اس میں شخصیات کی قلمی تصویریں بھی ہیں، ان کے سوانحی احوال کے تذکرے بھی اور ان کے علمی مراتب کا کھلے دل سے اعتراف بھی، لیکن پروفیسر دردائی نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ بہت ہی صاف گوئی، سنجیدگی اور ژرف نگاہی سے شخصیتوں کی بشری کمزوریاں بھی کسی لومتہ لائم کا خوف رکھے بغیر سپرد قلم کر دیا ہے۔

ان خاکوں میں شخصیت کی ذات بھی ہے اور بات بھی اور دونوں ہی پر پروفیسر دردائی نے اعتدال نظر اور اعتدال جذبے کے ساتھ منطقی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مشاہدات، خیالات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔

یہ بات بھی یقینی ہے کہ یہ شخصیتیں خاکہ نگار کے لئے محض سنی سنائی نہیں بلکہ بالمشافہ دیکھی ہوئی ہیں، اس لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان خاکوں میں خاکہ نگار کے اپنے ذاتی تجربات کا اثر بھی ہے۔ خاکہ نگار، شخصیات کا خیر خواہ ہوتا ہے اور اس رُخ سے بھی یہاں دردائی کی فنی عظمت مخفی نہیں ہے۔

مذکورہ اقتباسات اگر ایک بار اور پڑھے جائیں تو ایسا محسوس ہونا یقینی ہے کہ دردائی، بہرصورت اخلاقی پہلو کی کمزوری کے لئے کوئی تاویل پسند نہیں کرتے، وہ چاہتے ہیں کہ علمی شخصیت اپنے گوناگوں فضائل و کمالات کے دوش بدوش بہرصورت علم کے غرور اور علمیت کے احساس نارواسے دورِ دست رہے، اپنی صلاحیتوں کو غور سے پہچانے اور ارتکاز موضوع و ارتکاز صنف کے ساتھ کام کرے تاکہ اس کا کام زیادہ سے زیادہ ارجمندی پا سکے اور اس کا رویہ اندر سے یا باہر سے کسی کی اَنا کو ٹھیس پہنچانے والا نہ ہو، تاکہ لوگ اس سے قریب ہوں اور زیادہ سے زیادہ فیض پائیں۔ ان خاکوں سے یہ بھی مترشح ہوجاتا ہے کہ معین الدین دردائی، شخصیتوں کی نفسیات پہچاننے اور اس کا تنقیدی و تجزیاتی اظہار کرنے میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

پروفیسر دردائی کی اس کتاب میں مذکورہ شخصیات کے علاوہ جن شخصیتوں کا خاکہ ملتا ہے ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا احسن مارہروی اور اسرار الحق مجازؔ بھی شامل ہیں۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ پروفیسر معین الدین دردائی کے مقالوں کا مجموعہ ''تحقیقی مقالے'' اور ''لسانی مطالعے'' کے نام سے بھی اشاعت یافتہ ہے۔ اوّل الذکر مجموعہ پر سال اشاعت درج نہیں، یہ مجموعہ چار مقالوں پر محتوی ہے جن میں سے تین مقالے اردو زبان و ادب کے حوالے سے لسانی نوعیت کے ہیں اور چوتھا اور آخری مقالہ دکن

کے مثنوی گوشعرا پر ہے۔ ''تاریخ ادب اردو بہار'' میں قیاساً لکھا ہے کہ یہ کتاب ۵۵-۱۹۵۰ء کے درمیان دوران لکھی گئی ہوگی، جب کہ دردائی کے موخرالذکر مجموعہ کی اشاعت ۱۹۷۰ء میں ہوئی، اس مجموعہ کا انتساب انہوں نے اپنی اہلیہ انوری بیگم کے نام کیا ہے۔ اس میں دو مقالے وہ بھی شامل ہیں جو ''تحقیقی مقالے'' کی زینت بن چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر دردائی ادبی تاریخ وتنقید اور تحقیق کے ساتھ ساتھ لسانیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، انہیں تشریحی وتاریخی اور تقابلی مطالعہ لسانیات کا بخوبی وقوف تھا۔ دردائی کی آخری عمر میں (۱۹۷۹ء) منظر عام پر آنے والی میں ایک اور اہم کتاب ''پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضامین کے آئینے میں'' بھی ہے۔

پروفیسر دردائی کے ادبی مقالوں کی یہ خوبی پہلی ہی نظر میں سامنے آجاتی ہے کہ موضوع کی مناسبت سے، وہ تمہیدی حصہ میں بیش از بیش معلومات مہیا کردیتے ہیں۔ مثال کے لئے یہ قتباس دیکھئے:

''واقعہ کربلا کے بعد جب بنوامیہ نے مرثیہ گوئی حرام قرار دیا تو وہاں اس کا انحطاط شروع ہوا، لیکن اس کے باوجود بھی لوگ مرثیہ کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔ فرزدق نے برسر عام امام زین العابدین کی شان میں اشعار کہہ کر جیل کی سزا خوشی سے برداشت کی۔ ہارون رشید کی سخت مخالفت کے باوجود بھی جعفر برمکی کی مرثیہ گوئی سے ابتدا ہوئی، لیکن وہاں یہ صنف شاعری پھلی پھولی نہیں۔ فارسی کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یہاں ابتدا ہی سے تصنع، مداحی اور تکلف وغیرہ پر اس کی بنیاد قائم ہوئی۔ فارسی شعرا اگر کسی کی تعریف کرتے تھے تو بہت باقاعدہ طور پر اس کے لئے تشبیب وغیرہ کا سامان کرلیتے تھے۔ اگر کسی کا مرثیہ لکھنا ہوا تو اس میں بھی تکلف اور تصنع ضروری تھا۔ کچھ نہیں تو مرثیہ شروع کرنے سے پہلے ایک غزل ہی لکھ دیتے۔ عرب کی شاعری میں اس طرح کی مثال صرف ایک ابن علقمہ کی ملتی ہے، جس نے اپنے بھائی کے مرثیہ کی ابتدا غزل سے کی، لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ مرثیہ مرنے کے ایک سال بعد لکھا گیا تھا، ورنہ شاید یہ بھی مثال دینے کو موجود نہ ہوتا، مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ فارسی شاعری میں مرثیہ کا کوئی درجہ بھی نہیں ہے۔ فارسی میں بھی بعض بہت کامیاب مرثیے لکھے گئے ہیں۔ فردوسی نے سہراب کے مرنے پر اس کی ماں کی زبان سے جو مرثیہ لکھا ہے وہ بہت بلند اور کامیاب ہے۔ اس طرح فرخی کا مرثیہ بھی جو اس نے محمود کی وفات پر کہا تھا، بہت زیادہ دردانگیز ہے۔ سعدی اور خسرو کے دو مرثیے بھی بہت زیادہ مشہور ہیں۔ محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی۔ اس کے بعد ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہوگیا اور مرثیہ کے بہت سے اقسام ہوگئے۔ اردو میں مرثیہ کی ابتدا بہت ابتدا سے ہوئی ہے۔ اردو کا ابتدائی دور دکن سے متعلق ہے اور وہاں ہر دور میں کافی مرثیے ملتے ہیں۔ سلاطین دکن شیعہ مذہب کے تھے اور اس لئے فطری طور پر وہاں مرثیہ کو بہت عروج تھا۔''

درج بالا اقتباس جس مضمون سے لیا گیا ہے، وہ ماہنامہ ''ندیم'' جنوری ۱۹۴۵ء میں اشاعت یافتہ اُس مضمون کا تمہیدی حصہ ہے جس کا عنوان ہے ''انیس ودبیر اور اردو مرثیہ گوئی'' ظاہر ہے کہ آگے چل کر اس مقالے میں گفتگو تو حسب موضوع ہونی تھی اور ہوئی بھی ہے، لیکن یہاں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ عربی اور فارسی میں صنف مرثیہ کے تعلق سے دردائی نے بصد اختصار تاریخی معلومات کتنی سادہ اور صاف ستھری زبان میں قلم بند کردیا ہے اور اس تعلق سے عقائدی اور معاشرتی احوال کے اثرات بھی سامنے لا دیا ہے۔ اس طرح وسیع ترین علمی تناظر میں کسی مقالہ کی تمہید نویسی بجائے خود ایک فن ہے اور سچ تو یہ ہے کہ دردائی کے ادبی مقالات بالاستیعاب، تجزیاتی نظر سے پڑھے جائیں تو ان میں ایسے خوبصورت، مفید مقصد اور نادر فنی وفکری نمونوں کی دستیابی دشوار نہیں۔

پروفیسر معین الدین دردائی کی متنوع تصانیف اور ان کی متعدد تحریریں صرف ادبیات سے ہی تعلق نہیں رکھتیں بلکہ تذکرہ وتصوف

سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے اوراس کے ثبوت کے لئے ''تاریخ سلسلہ فردوسیہ''، ''صوفیائے بہاراوراردو'' اور ''صوفیائے سندھ اوراردو'' جیسی کتابوں کا نام لے لیناہی کافی ہے۔ ان میں سے اوّل الذکر کتاب ۱۹۶۲ء میں، ثانی الذکر کتاب ۱۹۷۲ء میں اور ثالث الذکر کتاب ۱۹۷۳ء میں چھپی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب ''مجلس صوفیا'' بھی ہے جو ۱۹۷۸ء میں چھپی تھی اوراس میں دورائے نہیں کہ یہ کتابیں اردو میں تذکرہ نگاری کی تاریخ میں افادات اور اضافات دونوں ہی پہلو سے ممتاز ہیں۔ دردائی کی ''تاریخ سلسلہ فردوسیہ'' کا دیباچہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے قلم سے ہے اوراس میں انہوں نے اگر یہ لکھا ہے تو یقیناً مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے کہ اس موضوع پر:

''آٹھ سو برسوں سے جو کام کسی سے نہ ہو سکا وہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس نحیف و ناتواں انسان کے ذریعہ پورا کردیا۔''

اس کتاب میں فردوسی سلسلہ کے ۲۸ بزرگوں کا تذکرہ ہے اور کتاب کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں ''اسلامی تصوف کے ارتقا اور تشکیل'' پر عالمانہ نظرڈالی گئی ہے۔ اسی طرح سید محمد نعیم ندوی کے لفظوں میں دردائی کی کتاب ''مجلس صوفیا'' کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ:

''ہمارے ان بزرگان دین نے تزکیہ نفس اور اپنے دور کے معاشرے کی اصلاح میں کیا خدمات انجام دیں، لوگوں کو دین کی طرف کیوں کر متوجہ کیا اور نیکیوں کو کس طرح پھیلایا۔ ان بزرگوں کی زندگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ لوگ بذات خود ہمہ تن خیر اور نیکیوں کے پتلے تھے۔'' (مجلس صوفیا، ص ۲۸)

دردائی کی اس کتاب میں فردوسیہ، قادریہ، جنیدیہ، سہروردیہ، چشتیہ اور نقشبندیہ سلسلے کے بانی مبانی بزرگوں کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔

پروفیسر معین الدین دردائی نے اپنی چند مترجمہ کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں جن میں ''ملفوظات حضرت بابا فریدالدین گنج شکر'' (۱۹۷۱ء) کے علاوہ حضرت خواجہ گیسودراز سید محمد حسینی کی کتاب اور معروف عرفانی تصنیف ''سیرالاقطاب'' کے تراجم شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ معین الدین دردائی کے علمی کارنامے کئی سمت رکھتے ہیں اور یہ کہہ کر گفتگو مختصر کی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ؎

ملک قلم کی شاہی ان کو سدا مسلم
جس سمت آگئے ہیں سکے بٹھا دئے ہیں

(بہار کی بہار، تاریخ اردو ادب بہار جلد دوم، پروفیسر اعجاز علی ارشد، ندیم کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد عزم الحق داؤدی، رسالہ ''سہیل: ایک تاریخ ساز جریدہ'' ڈاکٹر شاہد ساز ماہنامہ ''مہر نیم روز'' کراچی، اختر اوریینوی نمبر، ۱۹۷۷ء اور مجلّہ ''زبان وادب'' پٹنہ ج ۲۶، ش ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۵ء میں محمد ظفر علی خاں کے مقالہ ''معین الدین دردائی'' سے خصوصی اخذ واستفادہ کے ساتھ۔ واضح رہے کہ مئی ۲۰۰۸ء میں محمد ابوذر حسینی کی کتاب ''پروفیسر محمد معین الدین دردائی: حیات اور ادبی خدمات'' کی اشاعت کا ذکر ''بہار کی بہار'' مطبوعہ ۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے ''تازہ اطلاعات'' کے طور پر کیا ہے، مگر افسوس کہ یہ کتاب راقم الحروف کو بروقت نہیں مل سکی)

❀❀❀

ایک دستاویزی عکس

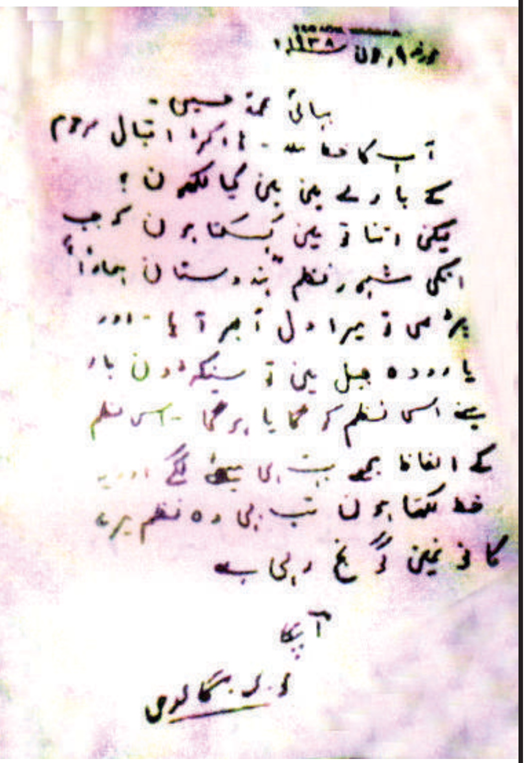
بھائی محمد حسین۔
آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم
کے بارے میں کیا لکھوں؟
لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب
ان کی مشہور نظم ہندوستان ہمارا
پڑھی تو میرا دل بھر آیا۔ اور
یروڈا جیل میں تو سینکڑوں بار
میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم
کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور
خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے
کانوں میں گونج رہی ہے۔
آپکا
مو۔ک۔ گاندھی

باپو کے ایک خط میں علامہ اقبالؔ (وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) کو خراج عقیدت

طلحہ نعمت ندوی
Asthawan, Bihar Sharif (Mob. 9117394766)

پروفیسر سید حسن عسکری کی اُردو تحریریں

سید حسن عسکری ملک کے مشہور مورخ گزرے ہیں، عہد وسطیٰ کی تاریخ پر ان کی عالمانہ اور مجتہدانہ نظر تھی، بالخصوص مسلم عہد حکومت اور عہد وسطیٰ کا پورا دوران کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ بہار کی تاریخ کے جونا معلوم گوشے انہوں نے وا کئے وہ ان کا اہم کارنامہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ تاریخ ان کی شخصیت کا عنوان بن گئی تھی، لیکن وہ صرف تاریخ ہی کے آدمی نہیں تھے بلکہ ادبیات، اردو زبان، ہندی زبان اور صوفیا کے تذکرے، سوانح اور تعلیمات پر بھی ان کی بہت گہری نظر تھی۔ انہوں نے اردو میں کم لکھا ہے، لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ اہل علم کے لئے ایک سوغات کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے اردو مضامین صوفیا کے اردو کلام، اردو ہندی لسانیات، اردو ادبیات اور اردو مخطوطات پر مشتمل ہیں۔ تاریخی اور علمی مضامین بیشتر انہوں نے انگریزی ہی میں لکھے ہیں جن میں سے کچھ کے اردو میں ترجمے کئے گئے ہیں۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی طرح وہ بھی ایک بار لکھ کر اس پر نظر ثانی کے عادی نہیں تھے، اس لئے ان کے یہاں بھی مولانا ہی کی کتابوں کی طرح سقطات بہت نظر آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ عربی فارسی عبارتیں اردو میں ملا کر بغیر ترجمہ کے لکھتے ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری کے اب تک جو مقالاتی مجموعے مرتب ہوئے ہیں ان میں ان کے اصل اردو اور ترجمہ شدہ دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں اور ان میں بعض میں اس کی وضاحت بھی نہیں کہ یہ ترجمہ شدہ ہے، اس لئے مترجم

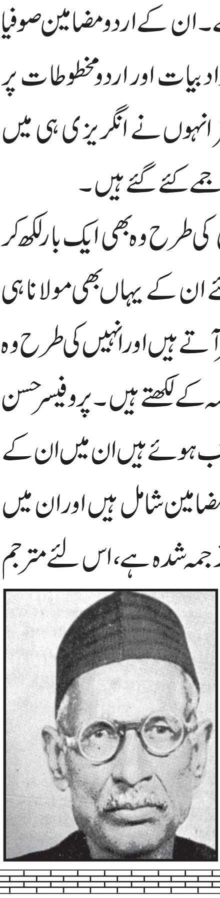

کی غلطیاں ان کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں، جب کہ ان کا مبلغ علم بہت بلند تھا اور اس طرح کی غلطیاں ان سے مشکل ہی سے صادر ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے تاریخی مضامین اردو میں کم ہی لکھے ہیں، بیشتر تاریخی مضامین انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں جو اغلب یہ ہے کہ ان کے کسی شاگرد نے ترجمہ کیا ہوگا۔ ان کے ایک مضمون پندرھویں صدی کے ایک بہاری صوفی بزرگ کے اخیر میں ''مترجمہ محمد یونس'' تحریر ہے۔ یہ مضمون دراصل انگریزی میں تھا، اسی طرح شیخ حسام الدین مانک پوری پر ان کا مضمون بھی انگریزی سے ترجمہ شدہ ہے، لیکن مترجم کے نام کی وضاحت نہیں ہے، اس میں کئی ایسی واضح غلطیاں موجود ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا کچھ بھی مشکل نہیں کہ یہ مضمون اشاعت سے پہلے جناب مصنف کی نظر سے بھی نہیں گزرا ہے۔

یہ کہنا تو مشکل ہوگا کہ پروفیسر سید حسن عسکری نے اپنے چند مضامین کا خود ہی ترجمہ کیا ہوگا، ایسا ممکن بھی ہے، لیکن اس کا امکان کم ہے یا ایسا بھی ممکن ہے کہ انہوں نے کچھ مضامین پہلے اردو میں لکھے ہوں، پھر ان کا انگریزی میں ترجمہ خود ہی کیا ہو یا کسی شاگرد سے ترجمہ کرایا ہو، لیکن یہ سب امکانات ہیں۔ بہر حال جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ کون سے مضامین ان کے اپنے ہیں اور کون سے ترجمہ شدہ، اس وقت تک ان کے اسلوب کا تعین مشکل ہے۔

ڈاکٹر محمد شمیم نے ''پروفیسر سید حسن عسکری کے اردو مقالات کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے جو غالباً ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، اس میں موصوف نے پروفیسر عسکری کے حالات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ان کے چند مقالات کا جائزہ لیا ہے اور ان کے اسلوب پر روشنی ڈالی ہے، لیکن انہوں نے بھی یہ وضاحت نہیں کی کہ ان کے کون سے مضامین اصل اردو میں لکھے گئے اور کون سے انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں، البتہ انہوں نے ان کے اسلوب کا تجزیہ کیا ہے اور ان مضامین کا ذکر کر کے ان کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بقول:

''سادگی، روانی، طویل جملوں کے استعمال پیچیدگی سے

پاک اور مسجع ومقفٰی عبارتوں سے اجتناب ان کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔ وہ محاورات بھی استعمال کرتے ہیں اور تشبیہات بھی، مصدر ''نا'' کی جگہ ''نی'' استعمال کرتے ہیں، جیسے بات کرنی، نگاہ ڈالنی۔

(پروفیسر حسن عسکری کے مقالات ص ۲۸۸)

پروفیسر حسن عسکری کے جو اردو مقالات مل سکے، ذیل میں ان کے عناوین کی فہرست پیش خدمت ہے۔ ان میں بیشتر پٹنہ کے مشہور ماہنامہ ''معاصر'' میں شائع ہوئے ہیں، کچھ مضامین دوسری جگہ بھی اشاعت یافتہ ہیں۔

(۱) قرون وسطٰی کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت، ماہنامہ ''ساتھی'' پٹنہ ۱۹۵۲ء، ش ۲،۳،۴
(۲) مثنوی گوہر جوہری، ششماہی اردو ادب (انجمن ترقی اردو) اپریل ۱۹۴۰ء
(۳) دیوان سید راجا، معاصر، حصہ ۵
(۴) اردو ہندی زبانیں، معاصر، پٹنہ، اپریل ۱۹۵۴ء
(۵) اوراق پارینہ معاصر، حصہ ۷، اس میں بزرگان پھلواری کی ایک بیاض کے اشعار کا تذکرہ ہے۔
(۶) تاریخ کشمیر کے چند قلمی نسخے، معاصر، مئی، جون ۱۹۴۳ء
(۷) بزم معاصر، معاصر جنوری ۱۹۵۶ء
(۸) دستور ملا فیروز، معاصر ۲۳
(۹) پروفیسر محفوظ الحق معاصر اگست ستمبر ۱۹۴۶ء
(۱۰) قاضی صاحب عالم اور انسان، معاصر قاضی عبدالودود نمبر
(۱۱) علم التاریخ، معاصر ۳۸، ۱۹۸۳ء
(۱۲) کہ کردکہ نیافت، معاصر ۳۰
(۱۳) نسخہ دلکشا، معاصر نومبر ۱۹۴۰ء
(۱۴) نسخہ مفید الانشا، معاصر، مارچ ۱۹۴۱ء
(۱۵) استدراک، بر نسخہ مفید الانشا، معاصر اپریل ۱۹۴۱ء
(۱۶) جنگ نامہ، معاصر اپریل تا اگست ۱۹۴۲ء
(۱۷) ظفر نامہ عالمگیری، معاصر مئی جون ۱۹۴۵ء
(۱۸) بہادر شاہ رنگون میں، معاصر ۱۹۶۲ء
(۱۹) غریبؔ کا اردو کلام، معاصر، حصہ ۳
(۲۰) شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی، معاصر، دسمبر ۱۹۵۳ء
(۲۱) دکنی اردو مخطوطات پر ایک نظر، معاصر حصہ ۵
(۲۲) ولیؔ ویلوری اور ان کا کلام، معاصر، حصہ ۸
(۲۳) سید عبدالقدوس گنگوہی اور ان کا اردو کلام، معاصر، دسمبر ۱۹۵۷ء
(۲۴) چندائن ملا داؤد، اپریل ۱۹۶۰ء
(۲۵) چندائن اور میناست، قدیم ہندی پرکھائیں، معاصر، اپریل ۱۹۶۰ء
(۲۶) ہندی فنون لطیفہ اور چندائن کی چند تصویریں، معاصر، جولائی ۱۹۶۰ء
(۲۷) بہار شریف میں قلمی نسخوں کے ذخیرے، معاصر ۱۹۷۵ء
(۲۸) اجاگر چند الفتؔ کا اردو کلام، معاصر، دسمبر ۱۹۵۲ء
(۲۹) جائسی اور چند مسلمان ہندی شعرا کے کلام کا ایک ہندی نسخہ، معاصر دسمبر ۱۹۵۳ء
(۳۰) کچھ مخدوم بہار کے ملافیظ ومکاتیب کے متعلق، معاصر، حصہ ۲۷
(۳۱) صوبہ بہار کے آخری ہندوستانی گورنر نظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر، تہور جنگ، ماہنامہ ندیم گیا، بہار نمبر ۱۹۴۰ء
(۳۲) اولین مسلمان اور دیسی بھاشائیں، پٹنہ یونیورسٹی جرنل ۱۹۵۵ء
(۳۳) سندیش رسک، ایک مسلمان کی ہندی میں منظوم کتاب، ششماہی مطالعہ، پٹنہ ۱۹۶۸ء
(۳۴) افسانہ بادشاہاں یا تاریخ افغانی کا ایک کمیاب نسخہ، ماہنامہ ساغر اردو ۱۹۶۴ء
(۳۵) حسام الدین مانک پوری، ماہنامہ، صنم اردو، پٹنہ، بہار نمبر ۱۹۵۹ء
(۳۶) گنج فیاضی، مشمولہ ''حیات کلیم''، مرتبہ سید محمد حسنین
(۳۷) سکھ مسلم تعلقات مغلیہ عہد میں، خدابخش لائبریری جرنل ۱۹۹۵ء
(۳۸) کچھ حشر سے متعلق، ماہنامہ ''آجکل'' ۱۹۷۹ء
(۳۹) حسینی میاں ظریف، ماہنامہ ''آجکل'' اکتوبر ۱۹۷۲ء
(۴۰) ''طبقات بابری'' کے عنوان سے انہوں نے جو مفصل مقالہ لکھا ہے وہ اصل انہیں کے قلم سے ہے، کیوں اس میں وضاحت ہے کہ انہوں نے طبقات بابری کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، ورنہ ان کا اصل کام اور اس کا مفصل تعارف انگریزی ہی

میں ہے، یہ مفصل مقالہ ۱۹۹۶ء میں اردو اکادمی پٹنہ سے شائع ہوا اور گیا کے مگدھ یونیورسٹی کے مجلّہ ''مشام'' میں بھی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

(۴۱) ''میرے دوست سہیل عظیم آبادی جو مجھ سے پہلے بلا لئے گئے'' یہ ماہنامہ ''سہیل'' گیا کے سہیل عظیم آبادی نمبر کے لئے لکھا گیا تھا، لیکن اس میں شائع نہیں ہوسکا، بعد میں جرنل خدا بخش لائبریری کے مارچ ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔

مذکورہ بالا مضامین میں سے آخرالذکر چار پانچ مضامین تو ان کے طبع زاد ہیں۔ مضمون نمبر ۳۵ ان کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے، جو مضمون سے بالکل ظاہر ہے۔

علاوہ ازیں ان کے چند مضامین ایسے ہیں جو انگریزی میں بھی ملتے ہیں اور اردو میں بھی اور اغلب یہ ہے کہ انہوں نے خود ہی ان کو پہلے اردو میں، پھر انگریزی میں یا اس کے برعکس لکھا ہوگا، کیوں کہ ان کے کسی مضمون کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کسی اور نے کیا ہو، اس کا امکان کم ہے، انگریزی میں پروفیسر حسن عسکری کا اپنا ایک خاص اسلوب تھا جو ان کی شناخت بن گیا تھا۔ ان کے مذکورہ مضامین میں سے جو مضامین انگریزی میں اسی عنوان سے یا اس سے ملتے جلتے عنوان سے ملتے ہیں وہ شیخ حسام الدین والے مذکورہ مضمون کے علاوہ حسب ذیل نمبرات کے مضامین ہیں:

نمبر ا، نمبر ۳، نمبر ۸، نمبر ۲۳، نمبر ۲۴، نمبر ۲۸، نمبر ۲۹،
نمبر ۳۰، نمبر ۳۱، نمبر ۳۴

ان میں مضمون ۳۴ نمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے جب کہ یہ انگریزی میں ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا، اس لئے ممکن ہے کہ خود صاحب مضمون نے پہلے اس کو اردو میں پھر انگریزی میں لکھا ہوگا۔ بہر حال اس سے اندازہ ہوا کہ مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ ان کے جو مضامین ہیں وہ بیشتر اردو میں ان کے طبع زاد ہیں۔ ان کا ایک مضمون ''مغل عہد میں شکار'' اس فہرست میں شامل نہیں ہوسکا وہ بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملتا ہے۔ ایک اور مضمون بھی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے دو مضامین ''دو مخطوطے'' اور ''دیوان نانک شاہ'' کا ذکر بھی کہیں کہیں نظر سے گزرا، لیکن تفصیل دستیاب نہیں۔ اب مذکورہ بالا مضامین کی فہرست کو سامنے رکھتے ہوئے سید حسن عسکری کے مضامین کے دو مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت ہے، ایک وہ مجموعہ جس میں ان کے خالص اردو مضامین ہوں۔ دوسرا وہ جو کسی نے ترجمہ کیا ہو یا اس کے بارے میں واضح نہ ہو کہ یہ خود مصنف نے لکھا یا ترجمہ شدہ ہے اور ان کے بقیہ انگریزی مضامین بھی ترجمہ کے بعد اس مجموعہ میں شامل کئے جائیں تو اس مجسمہ علم کی یاد کے ساتھ خود علم کی بڑی خدمت ہوگی۔ ❁❁

پھندنے: ایک تجزیاتی مطالعہ (ص ۲۵ سے آگے)

آتے ہیں تو دوسری طرف ایک ہی سطح پر موجود غیر موجود، مجرد غیر مجرد اور بے جان اشیا جاندار اشیا میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں۔ منٹو نے اسلوب بھی انہی حالات سے میل کھاتا ہوا اپنایا ہے۔ پورے افسانے پر خواب کی سی فضا کا دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ بار بار پڑھنے کے بعد ہی اس کے نقوش واضح ہوتے ہیں۔

منٹو کی اس کہانی کے تجزیے کے بعد بآسانی اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ یہاں معاشرے کے ایک ایسے گوشے پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اپنی اخلاقی بنیاد سے پوری طرح کٹ گیا ہے۔ جنسی بے راہ روی کو بیان کرنا منٹو کا تخلیقی مقصد نہیں بلکہ یہاں اصلاً موجودہ معاشرے کو ایک ایسی عورت اور اس کے برہنہ بدن سے تعبیر کیا گیا ہے جو اپنی جوانی کی کشش اور دلفریبی سے محروم ہو گیا ہے۔

زوال کا احساس اگر مثبت ہو تو وہ انسان، معاشرہ یا عورت کو عروج یا بلندی کی طرف مائل کرتا ہے اور اگر منفی ہو تو وہ اُسے عروج کی طرف لے جانے کے بجائے اس کے لئے مزید زوال کی وجہ بن جاتا ہے۔ عورت کو دیکھ کر چور کا راہ فرار اختیار کرنا اور پھر عورت کا چور کے ساتھ جنسی مباشرت کی تمنا اخلاقی زوال کی انتہا ہے۔ اسی انتہا کی پیش کش اس کہانی کا طرۂ امتیاز ہے جو منٹو کے فنی امتیاز کو نمایاں کرتا ہے۔ یہاں منٹو نے جو تجریدی اسلوب اختیار کیا ہے، جس طرح اس نے استعاروں، علامتوں اور اشاروں سے کام لیا ہے، اس کی بنا پر اس افسانے کو جدید افسانے کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ ❁❁

زیبا پروین
Nauzar Katra, Deewan Mohalla, Patna - 800008

شکیلؔ بدایونی کی شاعری: چند نکات

بیکس پہ کرم کیجئے سرکار مدینہ
گردش میں ہے تقدیر، بھنور میں ہے سفینہ

درج بالا نعتیہ شعر، دراصل ایک فلمی گیت کا ٹکڑا ہے۔ یہ گیت فلم ''مغل اعظم'' میں شامل ہے اور اس کا تعلق اس موقع سے جب ایک عورت (مدھوبالا) کو زنجیروں سے جکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ گیت نما نعت جس شاعر نے لکھا ہے، وہ کوئی اور نہیں شکیلؔ بدایونی ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ ساری رات فکر سخن میں غلطاں رہے تھے اور یہ شعر اس وقت ہوا تھا جب فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

بہرحال یہ الگ تفصیل ہے اور یہاں اس کی طرف جانا مقصود نہیں، بلکہ اس تمہیدی فضا بندی سے ہمیں جس رُخ کی طرف آنا مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ شکیلؔ بدایونی کی اصل شہرت اور شناخت اگرچہ ایک فلمی شاعر کی حیثیت سے ہے اور اُن کے فلمی گیتوں کی مقبولیت نے ہی انہیں ''گیت کار اعظم'' بنایا ہے اور اسی کی بدولت ان کی ادبی حیثیت، ان کے فلمی نغموں پر سبقت نہ پاسکی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شکیلؔ بدایونی صرف فلموں کے شاعر تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ مختلف اصناف سخن میں ان کی شاعری کا ادبی مرتبہ بہرصورت مسلم ہے۔

انہوں نے فلمی گیتوں کے شانہ بشانہ حمد و نعت بھی لکھا ہے، نظمیں اور غزلیں بھی لکھی ہیں اور قطعات و نغمات سے بھی شغف رکھا ہے اور فلمی نغمہ نگاری کی مصروفیات کے باوجود اردو شاعری کو اپنے کئی خوبصورت مجموعہ سے نوازا ہے۔

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے ایک خاص نکتہ کی نشاندہی غالباً نامناسب نہ ہوگی کہ ایک فن کار جس ماحول اور جس خاندان سے آتا ہے، اس کے اثرات اس کے فن سے کبھی بالکلیہ جدا نہیں ہوتے یا یوں کہا جائے کہ مغربی مفکر تین (Teen) کے نظریہ کے مطابق فن پارے کو فن کار کے عہد و ماحول اور اس کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا، کیونکہ اس صورت میں جو تصویر سامنے آئے گی وہ غلط کینوس پر رکھی ہوئی تصویر جیسی ہوگی اور اُسے دیکھنے والے غلط زاویہ سے دیکھنے والوں کی صف میں شمار ہوں گے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایک ایسا شاعر جو ایک عالم دین اور ایک امام و خطیب کا بیٹا ہو اور ایک ایسے خاندان کا فرد جس کے مورث اعلیٰ حضرت سراج الدین جیسے صوفی بزرگ ہوں جن کا لقب سوختہ تھا اور اتنا ہی نہیں بلکہ جس نے شاعری میں ضیاء اللہ قادری جیسے استاد سے عروض آہنگ کی تعلیم پائی ہو، وہ مذہبی عقائد و اعمال سے دستبرداری کا راستہ ہرگز اختیار نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بمبئی میں عبدالرشید کاردار سے ملاقات نے بیشک شکیلؔ بدایونی کی دنیا بدل دی اور ۱۹۴۷ء میں فلم ''درد'' سے شروع ہونے والا ان کا سفر ۱۹۶۸ء میں فلم ''سنگھرش'' تک پہنچ گیا، لیکن نہ تو ان کے مذہبی عقیدے پر اشتراکیت یا اس جیسے کسی دوسرے ازم کی چھاپ غلبہ پاسکی اور نہ ہی بزرگان دین سے ان کی عقیدت و محبت میں سرمو فرق آسکا۔

شکیلؔ بدایونی فلم نگری سے مسلسل وابستہ رہے اور بڑے بڑے اعزاز و اکرام ان کے حصے میں آتے رہے، مگر صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ انہوں نے مشاعروں کی دنیا سے اپنا عملاً رابطہ بنائے رکھا، مزارات

اولیا پر حاضری دیتے رہے، عراق کا سفر کیا اور غوث پاک کے دربار میں پہنچے اور یہ کہتے ہوئے پہنچے کہ۔

غلاف عرش حق ہے ظل سبحانی کی چادر ہے
اُٹھا لو سر پہ یہ محبوب سبحانی کی چادر ہے
شکیلؔ اپنے مقدر پہ مجھے خود رشک آتا ہے
نظر روضہ پہ سر پر شاہ جیلانی کی چادر ہے

بلکہ یہ بھی ہوا کہ فلمی دنیا میں رہتے ہوئے معروف زمانہ اشتراکی شاعر ساحرؔ لدھیانوی کے مشہور شعر کا جواب لکھنے میں بھی انہوں نے تامل نہیں کیا، یہاں تک کہ وہی تاج محل جس کے بارے میں ساحرؔ نے کہا تھا کہ۔

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

جب شکیلؔ بدایونی کی سخنوری کے کمان و کمند کا اسیر ہوا تو ساری دنیا کے لئے محبت کی نشانی بن گیا۔

ایک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

یہاں ساحرؔ اور شکیلؔ کی شاعری کا نظریاتی فرق روشن ہے اور اگر یہ لکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ جس طرح تنقید کی دنیا میں کلیم الدین احمد نے ترقی پسند اشتراکی نظریہ کی مخالفت کی، کچھ اس طرح فلم کی دنیا میں شکیلؔ بدایونی نے ترقی پسندوں کے نظریہ کو بالکلیہ رد کر دیا۔ بس فرق رہا تو اتنا کہ کلیم صاحب کو تو ہب سے سہارا ملا اور شکیلؔ بدایونی کو تصوف سے۔

فن کار کا تعلق چاہے نثری اصناف سے ہو یا شعری اصناف سے، بہرصورت اُس کی باقیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اُس کے نظریہ فن کی لازماً تلاش ہوتی ہے اور اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ شکیلؔ بدایونی نے نہ صرف ایسے اشعار کہے ہیں جو ترقی پسند مخالف نظریہ کے آئینہ دار ہیں، بلکہ انہوں نے شاعرانہ خودستائی کے طور پر ہی سہی، لیکن شاعری اور خصوصاً غزل کے تعلق سے اپنے افکار و خیالات واضح طور پر پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

عام قاعدہ یہی ہے کہ جب کوئی بڑا اور کامیاب فن کار اپنی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے اور کسی خاص صنف کے تعلق سے اپنی باتیں کہتا ہے تو اُن سے فنکار کا نظریہ بھی مل جاتا ہے اور متعلقہ صنف میں شعر و شاعری کے لئے ایک معیار و میزان بھی اور یہ بہت ہی خاص پہلو ہے کہ شکیلؔ بدایونی نے اس موضوع کو صاف صاف مبرہن کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر علی الخصوص غزل گو شاعر کا اندازِ بیان ایسا ہونا چاہئے جو زبان کی عصری ضرورت سے پوری طرح میل کھاتا ہو، یہاں رنگ تغزل کا دائرہ محدود نہیں بلکہ اتنا وسیع ہونا چاہئے کہ اس میں ہر شعبۂ ہستی، نہاں محسوس ہو، نہاں اس لئے کہ غزل بہرحال ''حرف برہنہ نہ گفتن'' سے عبارت ہے۔

غزل کی شاعری اُسی وقت موثر و مفید ہوسکتی ہے جب کہ اس کا ہر شعر احساس صداقت کا مجموعہ ہو اور اس کے ہر لفظ میں یک گونہ نشتریت پائی جائے۔ غزل گو شاعر کی شان یہ ہونی چاہئے کہ اس کی نظر محبوب کی خلوت پر بھی ہو اور اس کے کلام سے مظلوم کی آہوں کا دھواں بھی اُٹھ رہا ہو، گویا شکیلؔ نہ تو رومانیت پسندی کے یکسر مخالف ہیں اور نہ ہی غزل میں عصری حقیقت پسندی کے رویے سے انہیں اختلاف ہے بلکہ وہ ایک ایسی متوازن راہ اپنانا چاہتے ہیں جس میں چنگ و دُف اور بربط و مضراب کا سلسلہ بھی ہو اور تیغ و سناں کا تذکرہ بھی۔

شکیلؔ بدایونی چاہتے ہیں کہ غزلیہ کلام میں جذبات کے دریا موجزن رہیں، آتش ماحول بھڑکتی رہے اور اُسے اہل سیاست کے تنقیص بداماں رویے سے رستگاری نصیب ہو۔ آئیے یہ باتیں شکیلؔ بدایونی کی جس غزل مسلسل سے ماخوذ ہیں، براہ راست اس سے ضیافت کی سعادت حاصل کی جائے۔

اردو کو جس انداز بیاں کی ہے ضرورت
ملتا ہے وہ انداز بیاں میری غزل میں
محدود نہیں دائرۂ رنگ تغزل
ہر شعبۂ ہستی ہے نہاں میری غزل میں
ہر شعر ہے مجموعۂ احساسِ صداقت
ہر لفظ ہے نشتر کی زباں میری غزل میں
محبوب کی خلوت پہ نظر میرے سخن کی
مظلوم کی آہوں کا دھواں میری غزل میں

کچھ سلسلۂ چنگ و دُف و بربط و مضراب
کچھ تذکرۂ تیغ و سنان میری غزل میں
بھڑکے گی یوں ہی آتش ماحول کہاں تک
جذبات کے دریا ہیں رواں میری غزل میں
ہے ظلم شکیلؔ اہل سیاست کا یہ ورنہ
گنجائش تنقیص کہاں میری غزل میں

شاید کہ غزل کے تعلق سے شکیلؔ بدایونی کے مذکورہ اوصاف اور ان کی ذہنی قماش کا اندازہ رکھتے ہوئے جگرؔ مرادآبادی نے یہ کہا تھا کہ ''وہ شاعر فطرت ہیں، شاعر کاریگر نہیں''، یعنی ان کی شاعری یوں کہا جائے کہ محض ایک اچھے کاریگر کی کاریگری نہیں، بلکہ وہ ایک فطرت پسند فن کار کی فنکاری ہے۔ بیشک نوحؔ ناروی کے لفظوں میں ایک باکمال شاعر کے یہاں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ شکیلؔ کے غزلیہ کلام میں مشہود ہیں، یہاں تک کہ ترقی پسند شاعر ساحرؔ لدھیانوی نے بھی جگرؔ اور فراقؔ کے بعد آنے والی پود میں غزل کے حوالے سے شکیلؔ بدایونی کو ہندوستان میں اپنے طرز کا واحد شاعر کہا ہے۔

شکیلؔ بدایونی نے یوں تو ''چور''، ''تصادم'' اور ''نمائش''، ''زلزلہ'' اور ''شب رنگیں'' جیسی بلند پایہ اور مقبول نظمیں لکھی ہیں اور فراقؔ گورکھپوری جیسے شاعر کو نظم نگاری کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا احساس دلایا ہے اور ان کی نغمہ نگاری کے کیا کہنے! دنیا جانتی ہے کہ وہ فلمی گیتوں کے تاجدار ہیں اور اپنے نغموں سے اردو کو ملک کے گوشے گوشے میں گھر گھر پہنچا دیا ہے۔

شکیلؔ بدایونی نے کم وبیش دو دہائی سے زیادہ نغمہ نگاری کے میدان میں اپنے فن کا جوہر دکھایا۔ وہ جب اس دنیا کی طرف آئے تھے، اُس وقت ''گیت'' بیسویں صدی کی گویا نومولود صنف تھی، جس کی رونمائی پہلی چوتھائی میں ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ آرزوؔ، ساحرؔ، حسرتؔ، مجروحؔ اور کئی دوسرے شعرا اپنے اپنے فن کے جلوے دکھا رہے تھے۔ شکیلؔ بدایونی کے لئے مقابلہ کے اس میدان میں اپنی جگہ اور اپنی پہچان بنانا سہل نہ تھا، لیکن ایک کامیاب غزل گو ہوکر بھی انہوں نے گیتوں کی دنیا کو یکسر سجا دیا اور فرسودہ اور غیر سنجیدہ تخیلات کی قبائیں چاک کرکے اُسے ایک ملبوس نو بخش دیا، ایسا ملبوس نو جس پر عریانی، فحاشی، تلذذ پسندی اور پروپگنڈے بازی کا کوئی داغ دھبہ نہ تھا۔ بلاشبہ کلاسیکل شاعری کے اثرات، تغزل وتخیل کے حسین عناصر، خالص ہندوستانی زبان اور یک گونہ وجدانی کیفیت نغمات شکیلؔ کے درخشاں اوصاف ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ شکیلؔ بدایونی ان شاعروں میں ہیں جن کی بدولت فانیؔ کے بعد بدایون کا نام عوام و خواص دونوں تک پہنچا اور سلامت رہے غزلیات شکیلؔ کی شان وشوکت اور آن بان کہ اپنی ادبی زندگی میں نظریاتی لحاظ سے دوری کے باوجود علی سردار جعفری کو ان کی غزلوں سے دائمی قربت کے احساس کا اظہار کرتے ہی بنی اور مجروحؔ سلطانپوری کو بھی ان کے مکتب خیال سے اختلاف کے باوجود ان کی غزلوں پر رشک کے اظہار سے چارہ نہ رہا۔ آیئے، اب آگے بڑھنے سے پہلے شکیلؔ کے چند غزلیہ مطلعے دیکھتے چلیں ؎

نالہ کشو اٹھا دو آہ و فغاں کی رسمیں
دو دن کی زندگی ہے کاٹو ہنسی خوشی میں

مرے ہم نفس، مرے ہم نوا، مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں سوز عشق سے جاں بلب مجھے زندگی کی دعا نہ دے

نہ پیمانے کھنکتے ہیں نہ دور جام چلتا ہے
نئی دنیا کے رندوں میں خدا کا نام چلتا ہے

پی شوق سے واعظ ارے کیا بات ہے ڈر کی
دوزخ ترے قبضے میں ہے، جنت ترے گھر کی

یہ دنیا ہے، یہاں دل کا لگانا کس کو آتا ہے
ہزاروں پیار کرتے ہیں نبھانا کس کو آتا ہے

مذکورہ مطلعوں کی وساطت سے شکیلؔ بدایونی نے نہ صرف ایک رجائی شاعر کے طور پر خود کو سامنے لایا ہے، عشق والفت میں فنا پسندی کا مضمون باندھا ہے اور دنیا کی بے وفائی کا تجربہ ومشاہدہ اور کمیونزم یا الحاد کے مقابلے میں اسلامی اعتقادیات کا اشارہ سپرد قلم کردیا ہے بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ ان اشعار میں، تضاد، سہل ممتنع، محاورے کی حسن بندش اور

طنزیہ اظہار کی جو کیفیت ہے، وہ بھی یقیناً کسی سے چھپی نہیں رہ سکتی۔

بیشک شکیلؔ بدایونی کے کلام میں اظہار وفا کی سادگی بھی ہے، رومانی معصومیت کے خوبصورت تصورات بھی، محبوب پر گہرا طنز بھی۔

تم پھر اسی ادا سے انگڑائی لے کے ہنس دو
آجائے گا پلٹ کر گزرا ہوا زمانہ

جو نقاب رخ اٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اُٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

تم زمانے کے ہو ہمارے سوا
ہم کسی کے نہیں تمہارے سوا

شکیلؔ بدایونی نے غلط نہیں کہا ہے کہ۔

شکیلؔ تفسیر شعر اپنی جو پوچھتے ہو تو بس اتنی
جو نالہ سینے میں گھٹ رہا تھا وہ نغمہ بن کر نکل رہا ہے

میں شکیلؔ دل کا ہوں ترجماں کہ محبتوں کا ہوں رازداں
مجھے فخر ہے کہ مری شاعری مری زندگی سے جدا نہیں

شکیلؔ کی شاعری جیسا کہ کچھ اشارے ہو چکے، نہ صرف ان کے خاندانی اثرات اور ان کی زندگی کے کیف وکم سے ہم آہنگ ہے بلکہ اس میں عصری حسیت کا لطیف اظہار بھی ہے۔

ہوا جاتا ہے کم ذوق وفا دور ترقی میں
کہ اب جلتے نہیں، بیہوش ہو جاتے ہیں پروانے

شکیلؔ بدایونی کی شاعری اِس لحاظ سے یقیناً قدیم وجدید کا خوبصورت سنگم کہلانے کی حقدار ہے کہ ایک طرف انہوں نے داغؔ، حسرتؔ اور جگرؔ کی روایت شاعری کو زندہ کیا ہے اور قدیم رنگ تغزل کو فروغ دیا ہے اور دوسری طرف ایسے انداز سخن اور ایسے موضوعات ومضامین سے بھی واسطہ رکھا ہے جو دور جدید کے استاد شاعر کی حیثیت سے ان کے بلند وبالا مرتبہ کا احساس دلاتا ہے۔ شکیلؔ بدایونی کی شاعری میں تقابل وتفاوت کو دکھانے کا ایک خوبصورت وطیرہ ملتا ہے اور یقیناً انہوں نے ناصح کو جس انداز میں اس کی ظاہر پرستی کا احساس دلایا ہے، وہ دیدنی ہے۔

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم ، تری زندگی کنارا

مختصر توقیت شکیلؔ بدایونی

۱۹۱۶ء : ۳/ اگست، ولادت بمقام آبائی وطن بدایون، اصل نام: شکیل احمد، تاریخی نام: غفار احمد (جس سے ہجری سال ۱۳۳۵ھ برآمد ہوتا ہے جو عیسوی سال ۱۹۱۶ء کے مطابق ہے) والد گرامی محمد جمیل اختر قادری سوختہ امام مسجد بمبئی، والدہ لاڈلی بیگم بنت منشی نظام علی خاں۔ واضح رہے کہ شکیلؔ بدایونی کا خاندان والد کی طرف سے شیخ صدیقی اور والدہ کی طرف سے پیٹھان تھا، لیکن اپنے مورث اعلیٰ حضرت شاہ سراج الدین کے لقب ''سوختہ'' کی نسبت سے یہ ''سوختہ خاندان'' کہلاتا ہے، جس کے اپنے کچھ خاص رسم ورواج بھی تھے جس کا ذکر شکیلؔ بدایونی نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔ اس خاندان کے ایک فرد مبارک علی، پنڈت موتی لال نہرو کے یہاں منشی تھے، جن کا تذکرہ جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں کیا ہے۔ منشی مبارک علی کے فرزند منظر علی نے پنڈت نہرو کے ساتھ پڑھا اور وکالت کی سند لی تھی اور بعد میں ''سوختہ آشرم'' بنایا تھا۔

۱۹۲۵ء : دادا شیخ منشی ہدایت اللہ کی وفات

۱۹۲۹ء : پہلی غزل کہی، جس کا ذکر خود شکیلؔ بدایونی کے حوالے سے ویریندر سکسینہ بدایونی نے کیا ہے۔

۱۹۳۰ء : اخبار ''شان ہند'' میں پہلی غزل کی اشاعت

۱۹۳۲ء : باقاعدہ شاعری کا آغاز، مبشر علی صدیقی کی صراحت کے بموجب

ناصح نظر شناس نہیں ہم تو کیا ملال
جو دل کو دیکھتے ہیں ، نظر دیکھتے نہیں

شکیلؔ اپنی ہستی سے ہے رنگ محفل
زمانہ ہمیں ، ان کو ہم دیکھتے ہیں

شکیلؔ کی شاعری میں تسلی دینے کا انداز اور نفسیاتی بے نیازی سے کام لینے کا پیغام بھی اپنا منفرد اختصاص رکھتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم ظاہری تبدیلیوں سے پریشان نہ ہوں بلکہ باطنی اقدار واوصاف کی صیانت کا اہتمام کرتے رہیں، ماحول کی تلخی سے گھبرائیں نہیں، بلکہ رنگین اور روشن مستقبل کے تصور سے نفسیاتی توانائی لیتے رہیں، خصوصاً شعروادب کی دنیا سے وابستہ فن کاروں کے لئے بظاہر اپنی طرف روئے سخن رکھتے ہوئے درحقیقت ان کی نصیحت یہ ہے کہ وہ مخالفین کی پرواہ کئے بغیر قلم کی آبرو بچائیں اور اپنا کام کرتے رہیں ۔

کوشش یہ کیجئے کہ نہ بدلے رہِ وفا
انساں بدل گیا تو بدلنے بھی دیجئے

شعر و ادب کی راہ میں ہوں گامزن شکیلؔ
اپنے مخالفین کی پرواہ کئے بغیر

رنگینیٔ مستقبل روشن ہے نظر میں
ہم تلخی ماحول سے گھبرا نہیں سکتے

شکیلؔ بدایونی کے یہاں فلسفہ واخلاق کا مضمون جس طرح اضافی انتہاہی شان وشوکت کے ساتھ نظم ہوا ہے وہ بھی حددرجہ لائق اعتنا ہے۔ وہ آدمیت کی دائمی قدروں پر یقین رکھنے والے فن کار ہیں اور اسی یقین کے ساتھ وہ چاہتے ہیں کہ دشمنوں کے ساتھ بھی محبت بھرا سلوک کیا جائے زمانے میں عزم محکم سے کام لیا جائے اور بلندترین مناصب پالینے کے بعد بھی اپنے آپ کو یاد رکھا جائے کہ ہماری اصل حیثیت بس وہی ہے جسے محض خاک کا پتلا کہتے ہیں ۔

شکیلؔ انسان کو اک عزم محکم کی ضرورت ہے
چھپی ہے کامرانی سعی لاحاصل کے پردے میں

فطرتاً ہر آدمی ہے طالب امن و اماں
دشمنوں کو بھی محبت کی نظر سے دیکھئے

انساں ہزار منزل رفعت پہ ہو شکیلؔ
ایسے میں خود کو بھول نہ جائے تو بات ہے

شکیلؔ بدایونی کی شاعری بہرصورت کامیاب مستقبل کا یقین دلانے والی

۱۹۳۴ء : ابتدائی تعلیم اور بمبئی پاپولر ہائر سکنڈری اسکول میں پڑھنے کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ
۱۹۳۵ء : آل انڈیا مشاعرہ بدایون میں شرکت
۱۹۳۶ء : ہائی اسکول پاس ☆ پہلی نظم ''تصادم'' ☆ یکم اکتوبر، شادی ہمراہ سلمیٰ بنت قیصر حسین قادری
۱۹۳۷ء : مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں بغرض تعلیم داخلہ
۱۹۴۲ء : مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے بی اے پاس
۱۹۴۴ء : اشاعت ''رعنائیاں''، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، پیش لفظ بہ قلم جگرؔ مرادآبادی
۱۹۴۶ء : اشاعت ''نغمہ فردوس''، بمبئی سے ☆ عبدالرشید کاردار سے ملاقات
۱۹۴۷ء : فلمی سفر کا آغاز، فلم ''درد'' کے نغمے سے
۱۹۴۸ء : پہلا ایوارڈ، رسالہ ''دینی'' کا گولڈ مڈل
۱۹۵۰ء : اشاعت ''صنم وحرم'' مقدمہ بہ قلم فراقؔ گورکھپوری
۱۹۵۱ء : دہلی میں محکمہ رسد میں ملازمت تقریباً چار سال

شاعری ہے اوران کا یہ خیال بالکل واضح ہے کہ انسان جب مشکلوں اور آزمائشوں سے گزر جاتا ہے تو پھر اس کے لئے فکر وعمل اور ترقی کے اَن گنت راستے کشادہ ہوجاتے ہیں۔

شکیلؔ بدایونی ایک حقیقت پسند اورنہایت سنجیدہ فن کار ہیں اوران کو محض ظاہری نمائش سے سخت نفور ہے، وہ فطری اور اصلی اوصاف ہی کو لائق اعتنا سمجھنے والے شاعر ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ میدان عمل میں خود تیز گام رہنا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے قافلے میں سست گام افراد کی بھیڑ نہ ہو ؎

ہنستا ہوا تو کوہ حوادث سے گزر جا
پھر دیکھ کہ تیرے لئے میدان بہت ہیں

نسیم صبح میں نکہت نہ پھول میں خوشبو
یہی چمن ہے تو ایسے چمن سے دور چلیں
رفیق راہ نہ ہوں رہ روانِ سست قدم
جو ساتھ دے نہیں سکتے وہ ہم سے دور چلیں

حقیقت تو یہ ہے کہ شکیلؔ بدایونی کی شاعری جدول بہ جدول نہ جانے کتنے ہی انمول افکار اور ابتکاری انداز سے نوازتی ہے اور یقیناً اس میں مسرت وبصیرت کے بے شمار سامان موجود ہیں، خواہش تو یہی تھی کہ شکیلؔ کی شاعری پر ''حکایت لذیذ بود'' کے مصداق ''دراز تر گفتم'' کا موقع نصیب ہوتا، مگر یہاں ازروئے اختصار جو چند نکات سپرد قرطاس ہوسکے ہیں، وہ بھی بہرحال شکیلؔ بدایونی کی شاعری کے ادبی مرتبہ کی یقینی تفہیم سے شاید کہ قاصر نہیں۔

(شکیلؔ بدایونی: شخصیت اورفن، ڈاکٹر مسرت اللہ خاں مسرتؔ اشرفی بدایونی، مطبوعہ ۲۰۱۴ء، رفتگان کے گلاب چہرے، اسمٰعیل وفا، مطبوعہ ۲۰۲۰ء، شعرائے مہاراشٹر، خلیق الزماں نصرتؔ، جلداوّل مطبوعہ ۲۰۱۴ء سے خصوصی اخذ واستفادہ کے ساتھ)

❁❁❁

۱۹۵۷ء : ۲۰ نومبر، سر اقبال دارالمطالعہ بمبئی کا افتتاح ☆ دسمبر، اقبال لائبریری کا افتتاح

۱۹۵۸ء : فروری، لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کا مشاعرہ ☆ اشاعت مجموعہ ''شبستاں''

۱۹۶۰ء : فلم فیئر ایوارڈ

۱۹۶۱ء : یکم فروری، جشن شکیلؔ کے کل ہند مشاعرہ منعقدہ بدایون میں تاریخی استقبال
☆ فلم فیئر ایوارڈ ☆ اشاعت ''رنگینیاں'' لاہور ☆ اشاعت ''اب دھرتی کو آکاش پکارے'' پنجابی پستک بھنڈار، دہلی

۱۹۶۲ء : فلم فیئر ایوارڈ

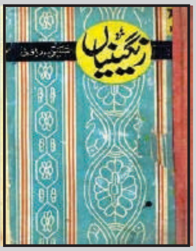

۱۹۶۳ء : ۱۱ مئی، سپاس نامہ عامیان ناگپور کی جانب سے

۱۹۶۵ء : ۴/اپریل سپاس نامہ منجانب انجمن ترقی اردو، دہلی ☆ اگست، سفر عراق

۱۹۶۶ء : بہترین فلمی شاعر کا ایوارڈ

۱۹۶۸ء : فلمی سفر کا اختتام فلم ''سنگھرش'' کے نغمے کے ساتھ

۱۹۷۰ء : ۲۰/اپریل ۴ بجے شام، وفات بہ رہائش گاہ ''روز کاٹیج'' باندرہ، مدفن باندرہ قبرستان، نزد مرقد والد محترم

۱۹۸۶ء : اشاعت ''زیبائیاں'' منجانب ادارہ جمہوریہ باہتمام ضمیر بدایونی

۱۹۸۷ء : اشاعت ''نغمہ فردوس'' باردگر

۲۰۱۳ء : یادگاری ڈاک ٹکٹ کا اجرا

❁❁❁

افسانے

عظیم اقبال
Adabistan, Ganj No-1, Bettiah- 845439 (Mob.9006502649)

کاش

''آسمان کی وسعت تو دیکھیں ذرا......! حدنگاہ تک آسمان ہی آسمان...... نیلا آسمان......سونا آسمان...... چپ آسمان......فکر میں ڈوبا آسمان......''

سحر نے کہا تو نجم نے تائید میں سر ہلا دیا:

''ہاں!......اور یہ پہاڑ......اونچے، نیچے......آسمان کو تکتے ہوئے ......گھورتے ہوئے ...... باہم گلے لگنے کے منتظر...... یہ کیسی حد ہے، ان کے درمیان...... یہ کیسا فاصلہ ہے۔''

سحر مسکرائی......شرمائی۔

''یہ سنگلاخ زمین، آسمان سے ہم کلام لگتی ہے، کیا کہہ رہی ہے بھلا......کوئی شکوہ، کوئی شکایت......کوئی التجا، کوئی درخواست......''

''نہیں! وہ چپ ہے، کوئی آواز نہیں، کوئی سرگوشی بھی نہیں، آسمان سے، نہ زمین سے...... سننے کی کوشش کرلیں، کہیں کچھ نہیں!''

نجم نے کہا:

''جی چاہتا ہے، یہیں تھم جائیں، رک جائیں، اوپر دیکھیں، اردگرد نگاہیں گھمائیں، پھرائیں! بس آنکھیں کھولے رکھیں، صرف تکتے رہیں، دیکھتے رہیں...... پلک تک نہ جھپکائیں۔''

یکا یک سحر نے بہت لگاوٹ سے نجم کی ہتھیلی تھام لی...... نرم، گرم......سرشار ہوئی...... بے خود ہوئی۔

نجم نے بھی گرم جوشی دکھائی اور گرفت کس لی۔ اندیشہ ہوا، کہیں نظر انداز کرنے کا بھرم نہ ہوجائے۔

محبت سے سرشار جوڑے نے بانہوں کا گھیرا تنگ کرلیا۔ بانہیں کستی چلی گئیں۔ دونوں ایک دوسرے میں سمانے کے لئے بے قرار ہوگئے۔ تھوڑی کسمساہٹ تھی، چند آہیں تھیں، سانسوں کی یلغار تھی...... ایک طرف آندھی تھی......ایک طرف طوفان تھا......

ایسی گھڑیوں کے لیے ہی انہوں نے ادھر کا قصد کیا تھا۔ تنہائی اور خاموشی کے لئے گنجان شہر کی بھیڑ بھاڑ اور گرد وغبار سے پرے، شناسا لوگوں سے دور، بہت دور...... جہاں وہ ہوں، وہ......دوسرا اگر کچھ ہو تو صرف ہوا، دھوپ، سایہ، پہاڑ، درخت، آسمان، زمین، ندی، پرندے اور پھول، پھول پر منڈلاتی تتلیاں......! رنگ برنگ کی...... خوش رنگ، خوش ادا تتلیاں۔

وہ یوں لپٹے رہے، جیسے پہلے کبھی ملے نہ ہوں، اب ملے ہیں تو ساتھ نبھانے کے لئے عہد و پیمان میں لگے ہوں۔ بدن سے بدن کی سرگوشی چل رہی ہو، جہاں دل یوں دھڑک رہے ہوں، جیسے یکسر اچھل کر جسم سے باہر آجائیں گے۔ دلوں کی یہ دھڑکنیں زمین نے سنی، وہیں آسمان نے بھی سنی!

زندگی ہو تو اپنی، لیکن اپنی نہ لگے تو کیسا احساس ہوتا ہے ...... بے کشش، بے رنگ، بے کیف، بے مزہ، زندگی کے اپنے پن کو محسوس کرنے کے لیے انہوں نے روزانہ کی مشغولیات سے مہلت لی تھی، فقط چند دنوں کے لیے، تاکہ تازگی بحال ہوجائے۔ جہاں لوگ چلتے نہ ہوں، دوڑتے ہوں، رُکتے ہوں، نہ تھمتے ہوں! سوتے نہ ہوں، صرف جاگتے ہوں۔ ایسے کہ نیند روٹھ جائے۔ وہاں سے انہوں نے راہ فرار نکالی تھی، جس یاس اور محرومی میں پھنسے تھے وہاں سے نکلنا ضروری تھا...... نکلتے تو شاید دھڑکنیں تھم جاتیں اور سانسیں رک جاتیں! بے حس و بے حرکت ہوجاتیں!

ایک جانب نجم کے دفتر کی آڈٹ کا اختتام ہوا، دوسری جانب سحر کے کالج میں کورسز خاتمے پر آئے پھر دونوں نے چندن گڑھ کا پروگرام بنالیا۔ نام تو سنا تھا، لیکن ادھر جانے کا خیال پہلے پہل آیا۔ ''نیٹ'' نے لوکیشن اور دیگر اطلاعات مہیا کرانے میں دیر نہ کی۔ کلک،

کلک، کلک نے سارے مسائل کے حل نکال دیے۔

رخت سفر سمیٹتے ہوئے پس و پیش کے لئے وقت تھا۔ نہ گنجائش تھی۔ کچھ زیادہ نہ ہو تو کچھ چھوٹ بھی نہ جائے۔ گھڑی، گھڑی اس سوچ نے گرفت میں رکھا، عجلت تھی، لیکن بدحواسی نہ تھی، جہاں زندگی کی سانس، سانس نپی تلی ہو اور دھڑکن، دھڑکن گنی گنائی ہو، وہاں دیگر کسی چیز کی وقعت رہتی ہے، نہ اہمیت، پھر بھی ان کا معاملہ کچھ اور تھا۔

اس جگہ وہ تنہا سیلانی نہ تھے...... جیسے چہروں کی رنگا رنگی تھی، ویسے ہی پہناوے بھی الگ تھے۔ گفتگو اور انداز گفتگو میں کوئی یگانگت نہ تھی، کچھ چپ، چپ تھے تو دیگر ویسے ہی چہک رہے تھے گویا پرندے ہوں...... ان کے لیے تجربہ نیا تھا، لیکن اکتا دینے والا نہیں تھا۔

رواں، دواں کہیں سے جھانکتے ہوئے نظارے پر لطف نہ لگے تو نجم نے سحر سے کہا:

''ہم تھیٹر میں بیٹھ کر کوئی فلم دیکھنے تو نہیں آئے کیوں نہ مٹر گشتی کریں...... رکیں، چلیں...... پھر رکیں، پھر چلیں...... ادھر دیکھیں، اُدھر دیکھیں...... پاس دیکھیں...... دور دیکھیں، پہاڑوں پر نگاہ ہو، آبشاروں پر نظر رہے۔ بادلوں کو مٹھی میں بھرنے کی جستجو ہو، ہواؤں کو ہتھیلیوں میں بھر لیں۔

سحر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور مسکرا دی۔

اشارہ پاتے ہی بس کے پہیے تھم گئے۔ ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گئے...... نجم اور سحر نے زمین پر قدم رکھ دیے، پروائی کے تیز جھونکوں نے ان کا خیر مقدم کیا...... ہاتھ لہرا کر پیر موڑ کر سیدھا کر کے رک، رک کر سانسیں کھینچ کر انہوں نے خود میں تازگی بھری۔ سمٹی ہوئی توانائی پھیل گئی۔

''اچھا کیا......!''

''ہاں! دم لیں گے، پھر چلیں گے!''

''ہوائیں چلتی ہیں تو سائیں، سائیں کرتی ہیں، گویا خراٹے بھر رہی ہوں! آپ کو کیسا لگتا ہے؟''

سحر محو حیرت تھی۔

''ہم اور آپ کی طرح فضائیں بھی سانس لیتی ہیں...... یہ ان کی سانسوں کی آواز ہے!''

نجم نے اس کی حیرت کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دی۔

''سچ کہتے ہیں آپ؟...... بولیے!''

سحر سراپا سوال بن گئی۔

''ہاں! کائنات کے ذرے، ذرے میں جان ہے اور جس کی جان ہے، اس کی تو سانس چلے گی ہی''

نجم نے وضاحت کی۔

سفید، سرمئی سیاہ بادل سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ چیلیں چکر کاٹ رہی تھیں، کوے کبھی آسمان کی وسعتیں ناپنے لگتے اور کبھی اتنا نیچے اتر آتے کہ لگتا جیسے کسی پیڑ پر وقتی پناہ لیں گے۔

نجم اور سحر کی ہتھیلیاں باہم پیوست تھیں۔ دونوں ساتھ ساتھ سر گھماتے، اوپر دیکھتے، آس، پاس نگاہ ڈالتے...... دونوں کی آنکھوں میں ایسی چمک در آئی تھی گویا ان میں برقی روشنی در آئی ہو! دونوں کے ہونٹ کبھی کھلتے، کبھی بند ہو جاتے۔

جو کچھ ہو رہا تھا، اس پر ان کا اختیار نہ تھا...... دیکھنے پر تو وہ آمادہ تھے، لیکن سوچنے پر مائل نہ تھے۔

ویسے اپنی چھت کے گملوں اور کیاریوں میں پھولوں کے کھلنے، دھیمے، دھیمے پنکھڑیاں کھلنے اور پھیلنے اور کلی کو پھول میں تبدیل ہونے کا سماں سحر کبھی بھولتی نہ تھی۔ کھوئی، کھوئی رہے تب بھی یہ منظر آنکھوں میں گھوم جاتا اور اس کا چہرہ استعجاب سے بھر جاتا۔

''اللہ......!''

دعا کے لیے اس کے ہاتھ اٹھ جاتے اور آنکھیں تر بہ تر ہو جاتیں۔

''تو خالق اور مالک ہے! بے جان کو جان دیتا ہے۔ کلی کو کھلا کر پھول بناتا ہے...... اُسے رنگ و بو سے بھر دیتا ہے!''

پھولوں کی وہ شیدائی تھی...... پودوں کی آبیاری یوں کرتی جیسے کہ عبادت میں مشغول ہو۔ جھونکے سے پانی ڈالنا روا نہ تھا۔

''آخر وہ بھی جان رکھتے ہیں...... کسی جان کو تکلیف دینا گناہ ہی تو ہے!'' پھول، ڈالیوں پر ٹنگے رہتے...... انہیں توڑنے پر کبھی روادار نہ ہوتی۔

موسم کے سرد و گرم کی تاب نہ لا کر پھول رنگ روپ کھو دیتے تو بڑا قلق ہوتا......اداس نظروں سے انہیں تاکتی رہ جاتی۔

''حسن کو زوال کیوں ہے......؟ زندگی کو فنا کیوں ہے؟''

ایسے اوقات میں اس کے خیالوں کی ڈور الجھنے لگتی اور اس کا سرا ڈھونڈنے میں وہ تادیر سرگرداں رہتی!

وہ اتر گئے تو بس رینگتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ چند لمحے نگاہوں میں سمائی رہی، پھر یکایک اوجھل ہوگئی......راستہ ہموار تھا اور نہ ناک کی سیدھ میں تھا، موڑ در موڑ تھے......کشادگی کم تھی......تنگی زیادہ۔

اچانک جس دھماکے نے چونکا دیا اور دلخراش چیخوں نے جھنجھوڑ دیا اور پھر جس خاموشی نے سرتاپا ہلا دیا، اُسے سب سمجھنے میں ساعتیں گزر گئیں۔

راستے سے تھوڑا پرے، پیڑوں کی جھاڑی میں کرسیوں پر بیٹھے لوگ چائے کی چسکیاں لیتے، لیتے رک کر انہیں تکنے لگے تھے۔

''آیئے......آیئے!''

نشست سے اٹھتے ہوئے ایک آدمی مخاطب ہوا:

''شاید آپ ہی دونوں بس سے اترے تھے؟''

دونوں نے بیک وقت سروں کو جنبش دی۔ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔

''آپ لوگ خوش قسمت ہیں!''

چائے کی پیالی نیچے رکھتے ہوئے دوسرا گویا ہوا۔

سحر اور نجم دونوں کی آنکھوں میں استفسار تھا، تاہم ان کے ہونٹ نہ ہلے۔

''بس نے جونہی موڑ کاٹا، پہاڑ سے ٹوٹ کر ایک بڑی چٹان آناً فاناً اس پر آ گری بس کچل کر بدشکل ہوگئی۔ کسی فرد کی جان نہ بچی!''

''اف......''

''سحر لرز گئی، اس کا سراپا خوف سے تھرانے لگا۔

نجم نے آہ بھری: ''کاش ہم بس سے اترے نہ ہوتے''

چائے کی پیالیاں ایسے دھری گئیں جیسے ارادتاً میز کو ضرب پہنچائی گئی ہو۔

سحر کی آنکھوں میں بھی سوال تھا۔

کوئی کچھ نہ بولا، لیکن کوئی آنکھ چپ نہ رہی......

''کیوں......؟''، نجم کے ہونٹ ہلے۔

''اگر ہم بس سے اترے نہ ہوتے تو بس کے رکنے اور آگے بڑھنے میں تاخیر نہ ہوتی اور اس کے آگے نکل جانے کے بعد ہی چٹان گری ہوتی!'' آہستگی سے سب نے اپنی اپنی پیالیاں اٹھائیں۔

ان دونوں کی آمد پر جس شخص نے انہیں خوش آمدید کہا تھا، گھوم کر دکاندار سے بولا:

''جناب! ذرا مہمانوں کی تواضع تو کریں!''

اس لمحے سحر نے نجم کی ہتھیلی تھامتے وقت یہ لحاظ نہ کیا کہ روبرو کچھ اجنبی بھی بیٹھے ہیں۔ ❁❁

شوکت حیات...... (ص ۲۸ سے آگے)

شوکت حیات کا ایک ناولٹ ''سرپٹ گھوڑا'' ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد کے شمارہ ۲۵۲ میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں جہاں جہاں گنجائش ملی وہاں وہاں انہوں نے اضافے کئے۔ اسے کتابی شکل میں شائع ہونا تھا، مگر وہ بھی بروقت شائع نہ ہوسکا۔ انہوں نے ڈراما اور ناٹک میں بھی خصوصی دلچسپی لی۔ یعنی ڈرامے لکھے اور اس میں اداکاری بھی کی۔ ان ڈراموں میں ''کالے کا بخار''، ''اندھے کا سپنا''، ''پنکھے والا''، ''داماد کا چناؤ'' اور ''گنبد کے کبوتر'' قابل ذکر ہیں۔

مختصر یہ کہ شوکت حیات نے اپنے اردگرد کے واقعات اور سانحات کو جس حسن وخوبی اور فنکاری سے پیش کیا ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کے یہاں ماجرا نگاری، پلاٹ، جاندار کردار سبھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے افسانے محض واقعات کی رپورٹنگ نہیں بلکہ جس باریکی سے واقعات کی پرتوں کو کھولتے ہیں اور جس طرح جزئیات نگاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سماج کی دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھتے ہیں وہ ان کا کمال ہے۔ ان کے یہاں عصری مسائل، خواہ سیاسی ہوں یا سماجی، معاشرتی، اقتصادی، تہذیبی۔ ان تمام مسائل پر ان کی فکرمندی اور فنی ہنرمندی دیکھنے کو ملتی ہیں جو ایک بلند آہنگ فنکار کی خصوصی پہچان ہے۔ افسوس! بہت سارے ادھورے خواب لے کر شوکت حیات اس دنیائے فانی سے محض ۷۰ سال کی عمر میں ۲۱ اپریل ۲۰۲۱ء کو رخصت ہوگئے۔ ❁❁

ڈاکٹر شاہد فروغی

C-1/507, Subhash Nagar Housing Complex (Post Pravash Nagar)
161 M.J. Road, Serampore, Hooghly - 712249 (Mob. 9339624245)

سڑا ہوا ہاتھ

دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ کمرے کے اندر بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، جس کی شعاعیں دروازے سے نصف برآمدہ تک ایک زاویے کی شکل بنا رہی تھیں۔ میں ٹھٹک سا گیا، ایک معمر شخص، لاغر سانولے رنگ کا جس کے رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں، میرے کمرے میں اکڑوں بیٹھا اپنے پیٹ کی آگ بجھانے میں مشغول تھا۔ اس کی پلیٹ کے سامنے ایک المونیم کا پرانا جگ اور ایک تھیلا تھا، جس میں کئی پیوند لگے تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے عادتاً سلام کیا۔
اس نے سر اٹھا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ میں خاموشی سے چارپائی پر بیٹھا ایک اخبار دیکھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری ماں ایک کٹورے میں دال لے کر آئی اور اُس اجنبی کے سامنے رکھ دیا۔

''اور کچھ چاہئے......'' میں اس اجنبی سے مخاطب ہوا۔

''نا......''

''اچار لاؤں......؟''

میری ماں نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

''اکٹونون داؤ'' اس نے بنگالی زبان میں کہا۔

میری ماں کچھ کچھ بنگلہ سمجھتی تھی۔ فوراً اس نے نمک لا کر دیا۔ وہ سر جھائے کھائے جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں ہر چند لقمے نگلنے کے بعد وہ دو گھونٹ پانی پی لیا کرتا تھا۔ اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ صبح سے ہی بھوکا ہوگا۔ میں اس کی ظاہری اور باطنی کتاب کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بنگالی زبان میں دریافت کیا:

''آپ کہاں رہتے ہیں......''

اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رُکنے کو کہا۔ میں سوچنے لگا یہ عجیب شخص ہے اور بڑے غور سے اس کی حرکتوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے طشتری سے ہاتھ ہٹا لیا کیوں کہ اس کی سانسیں اوپر نیچے کو دوڑنے لگی تھیں، دم اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ آخر برداشت کی حد ٹوٹ گئی اور یکا یک لعاب جیسا پانی اس کی ناک اور منھ سے نکل کر اس کی قمیص اور لنگی پر پھیل گیا۔ کچھ بوندیں کھانے کی پلیٹ میں بھی ٹپک پڑیں۔

یہ دیکھ کر میرا جی متلانے لگا۔ اچانک میرے ضمیر نے احساس دلایا کہ یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے اسے کھاتے وقت ٹوکا، ورنہ اس کے گلے میں چاول کے دانے اور پانی کے پھنسنے کی نوبت نہ آتی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے اندر کا طوفان ٹھہرا تو اس نے میری باتوں کا جواب نہایت سادگی سے بنگالی زبان میں دیا اور اپنی زندگی کی داستان سنانے لگا۔

میں دائمنڈ ہاربر کے ایک چھوٹے سے علاقے میں رہتا ہوں۔ میری ایک بوڑھی بیوی ہے۔ میں دن بھر قصبے قصبے، گاؤں گاؤں چکر لگاتا پھرتا ہوں۔ اب تو وہ پہلے جیسی آواز بھی نہیں رہی جو میں گا کر راہ گیروں کا دل جیت سکوں، دم پھولنے لگتا ہے، کھانسی ہونے لگتی ہے، کچھ عمر کا تقاضہ بھی ہے، پھر بھی ادھر اُدھر گشت کرنے سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، جس سے اپنا اور اپنی بیوی کا دوزخ بھرنے کا بندوبست کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے یہ تو نصیب کی بات ہے۔ دنیا میں ہر انسان تھوڑی بہت محنت اور کوشش کرتا ہے، لیکن سبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کوئی کم ہی محنت کرتا ہے، لیکن خدا ضرورت سے زیادہ اسے اُس کی اُجرت دیتا ہے۔ کوئی بہت ہی زیادہ محنت و مشقت، سعی اور تدبیر کرتا ہے، پھر بھی اسے خاک ہی نصیب ہوتی ہے۔ یہ سب قدرت کا کرشمہ ہے جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ اب مجھے ہی دیکھئے، میں کئی ہنر جانتا ہوں

راج مستری، گھرامی اور بڑھی سے لے کر کھیتی تک کا کام کر لیتا تھا، لیکن اب میں اپنے دائیں ہاتھ اور جسم کی کمزوری سے مجبور ہوں۔

سترہ سال قبل کی بات ہے میں ایک پیڑ سے آم توڑ رہا تھا، نہ جانے کس کی آہ میری جوانی کو لگ گئی۔ درخت سے پاؤں پھسل گیا اور میں زمین پر گر پڑا۔ نتیجہ میں دائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

اپنے گاؤں میں کوئی ایسا وید نہیں تھا جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ دے۔ پڑوسیوں سے میری تکلیف دیکھی نہ گئی، ان میں سے ایک نوجوان نے مجھے دور کے گاؤں کے ایک اسپتال میں لے جا کر میرے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کا پلستر کروادیا۔

ہفتہ بعد پلستر والے ہاتھ میں کھجلی سی ہونے لگی، لیکن میں نے اسے معمولی کھجلی سمجھ کر کوئی توجہ نہیں دی کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ تین ہفتے گزر گئے۔ پلستر والے ہاتھ میں جلن ہونے لگی۔ ایک روز درد اتنا بڑھا کہ میں تمام رات تکلیف سے تڑپتا رہا۔ صبح ہوتے ہی میں نے اپنے ہاتھ کے پلستر کا چاک چاک کر دیا۔ جب ہاتھ پر نظر جمی تو میری روح کانپ اُٹھی۔ جگہ جگہ کئی پھوڑے نکل آئے تھے، جن سے لہو رس رہا تھا۔ پلستر کے اندر سینکڑوں کھٹملوں کے انڈے بچے لال دانے کی شکل میں رینگ رہے تھے۔

ایک تو میں پہلے سے ہی کافی پریشان تھا۔ اس پر یہ دوسری مصیبت آن پڑی۔ جی میں آ رہا تھا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، سڑا ہوا ہاتھ لے کر میں کسی کے پاس بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی بدبو سے خود میرا جی متلانے لگتا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

میں ایک رات چپکے سے اپنے بستر سے اُٹھ کر خودکشی کی غرض سے ڈائمنڈ ہاربر ساحل کی طرف چل پڑا۔ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس گھنگھور اندھیرے میں دور دور تک سمندر کا پانی سیاہ بادل کی طرح آسمان سے ملتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اکیلا تھا، لیکن یوں لگتا تھا جیسے موت کا فرشتہ میرے سائے میں گم ہو کر پیچھے پیچھے چل رہا ہو۔ اس ہیبت ناک سناٹے میں صرف سمندر کا شور سنائی دے رہا تھا جیسے لاکھوں عفریت ایک آواز ہو کر شور مچا رہے ہوں:

''آجاؤ سمندر کی تہ میں......! آجاؤ سمندر کی تہ میں!''

میں سمندر کے قریب پہنچ کر پیچھے مڑا۔ ریت پر دور تک میرے قدموں کے نشانات بکھرے تھے۔ میں وہیں کھڑا اپنی جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا جو اَب مجھ سے ایک یا ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی، جہاں سے صرف لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی میں صاف صاف دیکھنے لگا کہ ایک عورت ہاتھ میں لالٹین لئے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے میری ہی طرف چلی آ رہی ہے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی یہ میری بیوی تھی۔ شاید نیند میں آنکھ کھل گئی تھی اور مجھے گھر میں نہ پاکر وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ساحل کی طرف آ نکلی تھی۔ شاید میرا مقصد سمجھ گئی تھی۔ وہ قریب، بالکل میرے قریب آ گئی اور میرے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسو اور معصوم چہرے کو دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ میرے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا اب اس کے لئے زندہ رہوں گا۔ ❁❁

اچھی غزل کی پہچان

غزل ایک داخلی صنف ہے جس میں انسانی جذبات واحساسات کا بیان ہوتا ہے، ایسے جذبات اور احساسات جو عشق ومحبت سے متعلق ہوں۔ محبت کا جذبہ انسان میں ابتدا سے پایا جاتا ہے اور غزل محبت کے جن جذبات کو پیش کرتی ہے وہ عموماً باپ بیٹے یا بھائی بہن کی محبت نہیں بلکہ صنفی محبت کے جذبے ہیں۔ بعض لوگ عشق حقیقی کی ترجمانی بھی اردو غزل میں کرتے ہیں، لیکن بنیادی طور پر غزل مرد کی محبت عورت کے ساتھ پیش کرتی ہے اور عربی میں اس لفظ کے معنی بھی عورتوں سے عشق ومحبت کی باتیں کرنا ہے۔ اچھی غزل وہی سمجھی جاتی ہے جس میں محبت کے جذبات سچائی اور خلوص کے ساتھ بیان کئے گئے ہوں، اس لئے غزل کی زبان سادہ ہونا چاہئے تاکہ فوراً سمجھ میں آ کر احساس کو متحرک کر دے، لیکن غزل کے بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں زبان سادہ نہیں اس کے باوجود ان میں تاثیر بھی ہے اور سچائی بھی۔ بہرحال غزل وہی اچھی ہوگی جس میں تاثیر موجود ہو۔ (حرف، غزل، ڈاکٹر مسیح الزماں، مطبوعہ ۱۹۵۱ء، ص ۷ و ص ۸ سے ماخوذ)

پروفیسر اسلم جمشید پوری
HOD, Urdu, CCS University,Meerut - 250001 (Mob.09456259850)

۲۰۲۴ء کے خوبصورت افسانوی مجموعے

اس بار(۲۰۲۴ء میں) کئی اہم افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ''جب تک ہے زمیں'' ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے محقق اور ناقد ہیں اور وہ ''مابعد جدید نو آبادیاتی مطالعے'' کے بنیاد گزار۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی قابل فخر انعامات مل چکے ہیں۔ ایسے بہت ہی کم لوگ ہیں جو تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ فکشن اور فکشن تنقید بھی لکھتے ہوں۔ وزیر آغا اور انور سدید کے بعد ناصر عباس نے تحقیق و تنقید کا علم بلند رکھا ہے۔ مغرب کی نئی تھیوریز ہو یا مشکل اصطلاح، ناصر عباس نے اپنے مطالعے اور رویے سے اسے آسان بنا دیا ہے۔

ناصر عباس نیر نے لیک سے ہٹ کر افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اور معاشرے میں روز بہ روز آنے والا تغیر افسانوی رنگ میں ملتا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں ۱۶ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض افسانے سماج کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اپنے ملک کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ادبی صورتِ حال کا بہت اچھا بیان ہیں۔ کچھ افسانے مثلاً ''گڑ اور گولیاں''، ''چائے کا ایک کپ'' اور ''چمڑے کا ایک پاؤچ''، ''نطشے اور مریل گھوڑا''، ''پہلے کھیل اور بعد میں لکھی گئی تمثیل''، ''اپنے ماضی کے خدا'' تو آج کے افسانے کی روایت میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔

''زندگی کا بازار'' لے کر کشمیر سے ڈاکٹر ریاض توحیدی آئے ہیں۔ یہ ایک ایسا بازار ہے جو بڑا عجیب وغریب ہے۔ ویسے تو یہ ریاض توحیدی صاحب کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس پر مرتب کی حیثیت سے انور مرزا کا نام ہے، جب کہ اندران کا ایک حرف بھی (مقدمہ وغیرہ) نہیں ہے۔

اس مجموعے کے نام کے نیچے ''مابعد جدید افسانوں کا انتخاب'' لکھا ہوا ہے۔ اس جملے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ریاض توحیدی کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ نہیں، بلکہ ان کے تمام افسانوں کا انتخاب ہے۔ اس میں ان کے کئی پرانے افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے اپنے عصر کی آواز ہیں، خاص کر کشمیریوں کی زندگی، ان کے سیاسی اور سماجی مسائل و معاملات، دہشت گردی اور خوف و ڈر کی کہانی موجود ہے۔ ریاض توحیدی کے معروف افسانوں میں ''جشن قبرستان''، ''کالی دھند اور سفید کبوتر''، ''جنت کی چابی''، ''دردِ کشمیر''، ''ناقوس و اذان''، ''زندگی کا بازار''، ''سنگ باز''، ''ہوم لینڈ''، ''گلوبل جھوٹ''، ''ہائی جیک''، ''کبوتر اور سانپ''، ''کشمیر نواز'' وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے اس مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ''زندگی کا بازار'' ہے۔ جس میں ایک پھیری والے کا کردار ہے، جسے لڑکوں بچوں، سب سے بڑا پیار ہے۔ وہ اپنی گٹھری میں طرح طرح کی چیزیں رکھتا ہے۔ کوئی بچہ اگر بغیر پیسے کے بھی کچھ لے لیتا تو وہ کچھ نہیں بولتا۔ وہ ایسی جگہ رہتا تھا جہاں ہر چیز خالص ملتی، جہاں کی آب و ہوا بھی نہایت صاف ستھری تھی، جب کہ کشمیر کے بہت سے علاقوں میں ملاوٹ عام تھی، کوئی بھی چیز خالص نہیں تھی۔ یہاں زندگی کا ہر آرام اور آسائش موجود تھی، کیا اے سی، کمپیوٹرس، موبائل، انٹرنیٹ، بڑے بڑے محلات، قیمتی گاڑیاں، اولڈ ایج ہاؤس سب کچھ موجود تھا، لیکن سکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا ایک جملہ تو مصنف کو بہت پریشان کرتا تھا:

''زندگی کی سب دکانیں بند ہیں اس شہر میں۔''

دراصل اس افسانے میں قدیم اور جدید زندگی اور ماحول کا تقابل کیا گیا ہے جس کے لئے مصنف نے پھیری والے کو واسطہ بنایا ہے، جس کی زندگی میں بظاہر کوئی آرام نہیں، مگر اس کے پاس ہر چیز میں شفافیت ہے۔ اس کی زندگی میں سکون ہے جب کہ جدید عہد میں ہر طرح کی سہولتیں ہونے کے

چاچی : بہت بھلا نام ہے۔ اللہ نے بارہ سال بعد اجڑے باغ میں پھول کھلایا ہے۔ جب یہ لڑکا بڑا ہوگا تو یہ رحیم کے ساتھ ہی کام کرے گا۔ اس سے رحیم کی ساری پریشانیاں اللہ نے چاہا تو دور ہوجائیں گی۔

رحیم : نہیں چاچی...... میں اسے اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔

ریشما : میرے شوہر کی باتیں سر آنکھوں پر، ان کی پسند میری پسند......

کریم : (رحیم کو سمجھاتے ہوئے) بیٹا رحیم...... ہم لوگ غریب ہیں۔ اتنی قلیل تنخواہ میں اسے کیسے پڑھائیں گے؟

رحیم : کریم چاچا...... عامر کی پڑھائی میں جو بھی خرچ ہوگا، اسے میں برداشت کروں گا۔ مجھے صرف آپ دونوں کی دعائیں چاہئے۔

کریم : ہم دونوں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، لیکن بیٹے......! تم پڑھائی کا خرچ کیسے برداشت کروگے......؟

رحیم : میں فیکٹری میں نائٹ ڈیوٹی کرلوں گا۔

کریم : (سمجھاتے ہوئے) نہیں بیٹا...... نہیں...... میں تمہیں نائٹ ڈیوٹی نہیں کرنے دوں گا، کیوں کہ اس سے تمہاری صحت خراب ہوجائے گی۔ ویسے ہم سب تو اَن پڑھ ہی رہے۔ ہم لوگوں کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے تم دیکھ رہے ہو۔ ایسے حالات میں یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟

چاچی : ارے رحیم بیٹا...... آج ہی لڑکا پیدا ہوا ہے بحث کیوں کر رہے ہو، اگر اس کے نصیب میں ہوگا تو ضرور پڑھے گا۔ اسے کون روک سکتا ہے؟

رحیم : آپ ٹھیک کہتی ہیں چاچی......

(پھر آٹھ بجے رات میں کریم چاچا اور گاؤں کی ساری عورتیں و مرد یکے بعد دیگرے اپنے اپنے گھر کی جانب چلے گئے۔

----پردہ گرتا ہے----

تیسرا منظر

(سترہ سال بعد)

مقام : چینی کارخانہ

وقت : تقریباً ڈیڑھ بجے دوپہر

(عامر فرسٹ ڈویژن سے ہائر سکنڈری پاس کر جاتا ہے۔ یہ خبر رحیم تک پہنچتی ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہوجاتا ہے اور اپنے کارخانے کے سب ساتھیوں اور کریم چاچا کے لئے مٹھائی کا ڈبہ لے کر کارخانہ پہنچتا ہے)

رحیم : کریم چاچا...... آپ کا پوتا عامر فرسٹ ڈویژن سے ہائر سکنڈری پاس کر گیا۔ یہ لیجئے میٹھائی...... میرے ہاتھ سے کھائیے۔

(مٹھائی کھانے کے بعد رحیم سے کہتا ہے)

کریم : رحیم بیٹا...... اب کیا ارادہ ہے...... کیا عامر کے لئے کوئی نوکری تلاش کروگے؟

رحیم : نہیں چاچا...... صرف ہائر سکنڈری پاس ہونے سے اچھی نوکری نہیں ملے گی۔ میں اسے بی اے تک پڑھاؤں گا۔

کریم : (چونکتے ہوئے) بی اے تک پڑھاؤ گے؟ کہیں تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں بیٹا...... تمہاری صحت دن بہ دن گر رہی ہے، اِدھر تم برابر بیمار ہی بیمار رہ رہے ہو۔ میں ابھی جا کر کارخانہ کے مالک سے عامر کی نوکری کے لئے بات کرتا ہوں۔

رحیم : نہیں چاچا...... میں عامر کو بی اے تک ضرور پڑھاؤں گا۔

کریم : بی اے پڑھانے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا بیٹا؟

رحیم : میں کسی نہ کسی سے قرض لے لوں گا چاچا۔

کریم : قرض کون دے گا رحیم......؟ اگر قرض مل بھی جائے گا تو اسے کیسے ادا کروگے؟

رحیم : (ہنستے ہوئے) عامر کے کام پر لگ جانے کے بعد وہ قرض اللہ نے چاہا تو فوراً ادا کردوں گا۔

کریم : (سمجھاتے ہوئے) رحیم بیٹا...... تم بیوقوف ہو۔ آج کے زمانے میں لڑکوں پر بھروسہ کرنا عقل مندی نہیں ہے۔ شادی ہونے کے بعد لڑکے ماں باپ کو بھول جاتے ہیں۔ تب قرض کا تمام بوجھ تمہارے سر پر آجائے گا۔

رحیم : نہیں چاچا! عامر ایسا نہیں کرے گا۔ مجھے اس پر مکمل یقین ہے۔ اگر وہ الگ ہوگیا تو بھی میں کسی طرح قرض ادا کردوں گا۔

کریم : رحیم بیٹا...... میں تمہیں زیادہ سمجھا نہیں سکتا کیوں کہ تمہارے دل میں بیٹے کی محبت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ تم کو جو بھی کہا جائے گا وہ برا لگے گا۔ ویسے میرا دل نہیں مان رہا ہے کہ تم قرض دار بن کر بیٹے کو پڑھاؤ۔ آگے تمہاری مرضی۔

رحیم : کریم چاچا...... میں ذرا فیکٹری کے مالک سے مل کر آتا ہوں

کریم : تم نے اچانک فیکٹری کے مالک سے ملنے کا ارادہ کیوں کیا؟ کیا بات ہے؟

رحیم : چاچا...... مجھے اُن سے قرض کے لئے پوچھنا ہے۔

کریم : اچھا چلو...... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔

(پھر یہ دونوں فیکٹری مالک کے گھر کی جانب چل پڑے)

مالک : (کریم اور رحیم کو دیکھتے ہوئے) کیا بات ہے، آج دونوں ایک ساتھ یہاں کیسے؟

کریم : (رحیم کو اشارہ کرتے ہوئے) رحیم بتاؤ!

رحیم : (سہمتے ہوئے) مالک میں آپ کے یہاں بیس برسوں سے کام کر رہاں ہوں، لیکن کبھی بھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔

مالک : (ہنستے ہوئے) رحیم! تم جو مانگو گے انشاء اللہ میں دینے کی کوشش کروں گا۔

رحیم : (ڈرتے ہوئے) مالک! میرا بیٹا عامر ہائر سکنڈری بورڈ پاس کر گیا ہے۔ اسے کالج میں داخلہ کے لئے چار ہزار روپے بطور قرض چاہیے۔

مالک : (کچھ دیر سوچنے کے بعد) اتنی بڑی رقم؟ ٹھیک ہے، تم کو ایک شرط پر روپے دے سکتا ہوں۔

رحیم : (دونوں نے کہا) شرط......؟

مالک : رحیم...... تم کو اسٹامپ پیپر پر دستخط کرنا ہوگا اور کریم چاچا کو اس رقم کے لئے ضمانت دینا ہوگا۔

رحیم : ٹھیک ہے۔ آپ کی شرط منظور ہے۔ (دونوں نے بیک زبان کہا)

مالک : ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسٹامپ پیپر لے کر میں خود ہی کارخانے میں آتا ہوں۔ (رحیم اور کریم دونوں فیکٹری کے مالک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کارخانے کی جانب چلے گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد کارخانہ کے آفس میں مالک نے اسٹامپ پیپر پر دستخط لے کر روپے دے دیئے۔ رحیم یہ رقم لے کر خوشی خوشی گھر آیا اور بیٹے عامر سے کہا)

رحیم : بیٹے عامر! یہ روپے لو اور کل ہی صبح سویرے شہر جا کر کالج میں داخلہ لے لو......

عامر : (روپے ہاتھ میں لیتے ہوئے) ہاں ابا حضور......! میں کل ہی شہر جا کر بی اے میں داخلہ لے لیتا ہوں۔ آپ اطمینان رہیں۔

(اب رحیم فیکٹری میں دن کے علاوہ رات میں بھی کام کرنے لگا۔ وقت یوں ہی گزرتا رہا اور عامر ہر سال کامیاب ہوتا رہا۔ رحیم کی صحت دن بہ دن گرتی رہی اور ایک دن اس کے منھ سے خون بھی آیا۔ اس نے سوچا یہ وقتی ہے۔ عامر کام پر لگ جائے گا تو علاج کرالوں گا۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ آخر وہ دن بھی آیا جب عامر فائنل ایئر میں اول درجہ سے کامیاب ہوا۔ اس کامیابی کی خبر کریم چاچا کو جلد از جلد سنانے کے لئے رحیم ان کے گھر کی طرف دوڑ گیا۔)

رحیم : (خوشی سے) کریم چاچا...... کریم چاچا...... آپ کا پوتا عامر بی اے پاس کر گیا۔

کریم : اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

رحیم : کریم چاچا...... اگر آپ میرا ساتھ نہ دیتے تو عامر کبھی بھی پڑھائی مکمل نہیں کر پاتا۔ اس خوشی کے موقع پر آپ کو ایک اور خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔

کریم : (چونکتے ہوئے) رحیم بیٹا...... وہ کون سی خوش خبری ہے؟

رحیم : کریم چاچا...... میں آپ کی نواسی رضیہ کو عامر کے لئے مانگنے آیا ہوں۔ بس آپ ہاں کہہ دیجئے۔

کریم : رحیم بیٹا...... کیا کہہ رہے ہو؟ عامر پڑھا لکھا لڑکا ہے اور رضیہ اَن پڑھ، ایسے میں یہ شادی کیوں کر ہوسکتی ہے؟ نا بابا...... نا

رحیم : کیوں نہیں ہوسکتی؟ میں بھی تو اَن پڑھ تھا، میری بیوی پڑھی لکھی تھی، پھر بھی ہم دونوں کی زندگی خوش اسلوبی سے گزر

رہی ہے یا نہیں؟

کریم : رحیم بیٹے...... تیری اور ریشما کی بات کچھ اور ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں۔(تھوڑی دیر بعد) عامر کی کیا رائے ہے؟

رحیم : عامر سے کیا پوچھنا۔ وہ میری بات ٹال نہیں سکتا؟ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم دونوں نے مل کر اسے پڑھایا ہے۔

کریم : بیٹا! پڑھائی کی کہانی اور شادی کا قصہ الگ الگ ہے۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔ تمہاری خوشی، میری خوشی۔

رحیم : چلئے چاچا...... عامر گھر پر ہے...... ہم سب مل کر اس سے بات چیت کرتے ہیں۔

کریم : ٹھیک ہے رحیم۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔

(پھر رحیم، کریم چاچا اور چاچی کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔)

----پردہ گرتا ہے----

چوتھا منظر

مقام : رحیم کا جھونپڑا نما مکان

وقت : چار بجے شام

(عامر اپنے گھر میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ کالج کے چند دوست اسے مبارک باد دیتے ہوئے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ اسی درمیان رحیم، کریم چاچا اور چاچی کو لے کر گھر میں داخل ہوتا ہے۔ عامر کریم چاچا کو دیکھ کر لپٹ جاتا ہے۔)

کریم : بیٹا عامر! تمہاری کامیابی ہم سب کی کامیابی ہے۔ اللہ تمہیں ہر جگہ کامیاب کرے۔

عامر : دادا جان...... یہ سب آپ کی دعاؤں کا اثر ہے ورنہ......

کریم : نہیں بیٹا! ایسی بات نہیں، بلکہ تمہاری محنت اور لگن نے ہی ہم سب کو خوشیاں دی ہیں۔

(اسی درمیان رحیم نے عامر کو کہا)

رحیم : عامر بیٹا! آج میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ایک دوسری خوش خبری بھی دینا چاہتا ہوں۔ (رحیم کی اس بات پر عامر اور اس کے دوست چونک پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگتے ہیں۔)

رحیم : (عامر کو دیکھتے ہوئے) دوسری خوش خبری تیری شادی کی ہے۔ (عامر اپنی شادی سے متعلق سن کر شرما گیا۔ عامر کے ایک دوست نے پوچھا رحیم چاچا! عامر کی شادی کہاں طے کی ہے؟ ہم دوست بھی تو جانیں۔)

رحیم : اپنے کریم چاچا کی نواسی رضیہ سے......اور......

عامر : (بات کو نظر انداز کرتے ہوئے) ابا جان! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ مجھ سے پوچھے بغیر شادی کی بات کیوں کی؟

رحیم : اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے......؟ کیا بیٹے ہر کام بس تمہاری مرضی سے ہوگا؟

عامر : نہیں......ابا جان......ایسا نہیں......شادی تو اپنی پسند سے......

رحیم : (عامر کی بات مکمل ہونے سے پہلے) کیا تمہیں اپنے باپ کی پسند منظور نہیں؟ (طنزیہ لہجے میں) اب تو تم برے بھلے کی پہچان والے ہو گئے ہو۔ ارے بیٹا! کیا میں نے تمہاری مرضی پوچھے بغیر نہیں پڑھایا؟ پھر......

عامر : ابا جان......آپ ایک اَن پڑھ لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں؟ میں پڑھی لکھی اپنی کلاس فیلو فوزیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ میں پڑھ لکھ کر ایک اَن پڑھ لڑکی سے شادی کروں۔

رحیم : عامر! اگر تم میری بات نہیں مانوگے تو میں تمہیں اس گھر سے نکال دوں گا اور پھر ہم دونوں سے رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔

عامر : (کچھ دیر سوچنے کے بعد) ٹھیک ہے...... میں آپ کا گھر اسی وقت چھوڑ دوں گا۔

(ریشما جو خاموش بیٹھی باتیں سن رہی تھی، اس نے اُٹھ کر زوردار طمانچہ عامر کے گال پر مارتے ہوئے کہا)

ریشما : کیا کہا تم نے؟ گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ سے رشتے کو توڑ دوگے، صرف ایک لڑکی کے لئے جو اتنے سالوں تک تمہاری خاطر تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ اس باپ ماں کو

چھوڑ جاؤ گے؟ واہ بیٹا......واہ......!

عامر : تو کیا میں آپ کی طرح ایک اَن پڑھ سے شادی کر کے اپنی زندگی کو جہنم بنالوں؟ (ماں کو سمجھانے کے انداز میں) آپ ہی بتاؤ ماں۔ اگر آپ پڑھے لکھے شخص سے شادی کرتیں تو آرام سے زندگی گزرتی۔ آخر ابا نے آپ کو کون سا آرام دیا؟ ہر وقت تکلیف اور مصیبت......اور......کیا؟

ریشما : (عامر کو زوردار تھپڑ مارتے ہوئے) خبردار تو نے اپنی گندی زبان سے میرے شوہر کا نام لیا۔ اگر وہ چاہتے تو ہم دونوں آرام سے زندگی گزارتے اور تمہیں اَن پڑھ چھوڑ دیتے۔ (غصہ میں) نالائق......نکل جا میرے گھر سے......زندگی بھر تم اپنا منھ نہ دکھانا۔ ہم دونوں تیرے لئے مر گئے۔ (عامر فوراً تیز قدموں کے ساتھ گھر سے نکل جاتا ہے۔ رحیم جو گھر کے ایک گوشے میں کھڑا باتیں سن رہا تھا، اس نے روتے ہوئے ریشما سے کہا)

رحیم : ریشما......وہ جا رہا ہے اسے روک لو......اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ تم روک لو! (رحیم کے گڑگڑانے کے باوجود عامر پیر پٹکتے ہوئے گھر سے نکل گیا۔ کریم چاچا اور چاچی بھی رحیم کی حالت دیکھ کر رو رہے تھے)

کریم : (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) بیٹا رحیم! یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ مجھے معاف کردو بیٹا۔ میں نے تم کو پہلے ہی کہا تھا، مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ دیکھو ریشما بھی کافی پریشان ہے، اسے سنبھالو۔ (پھر کریم چاچا، چاچی کو لے کر رحیم کے گھر سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گئے)

رحیم : ریشما......صبر کرو......ہم دونوں نے کتنی تکلیفیں برداشت کر کے اسے پڑھایا لکھایا اور وہ ہم دونوں کو یوں ہی چھوڑ گیا؟ ہاں یہ سچ ہے کہ تم نے میرے ساتھ کبھی آرام کی خوش گوار زندگی نہیں گزاری۔

ریشما : (رحیم کے منھ پر ہاتھ رکھ کر) نہیں میرے سرتاج، ایسا مت کہئے، آپ نے مجھے بہت اچھی طرح رکھا، آپ جیسا شوہر ہر عورت کو نصیب کہاں؟

رحیم : نہیں......نہیں ریشما! مجھ جیسا بدنصیب شوہر اور باپ اس دنیا میں کہاں ملے گا؟

ریشما : نہیں......میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ عامر جیسی نافرمان اولاد کو میں نے جنم دیا۔ ہم دونوں نے کتنے اچھے اچھے سنہرے خواب بُنے تھے۔ وہ سب چکنا چور ہو گئے۔

رحیم : ریشما......اب ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے......؟ اور کیوں رہیں گے اور کس کے لئے؟

ریشما : میرے سرتاج...... پہلے ہم دونوں عامر کے لئے جی رہے تھے، لیکن اب ایک دوسرے کے لئے زندہ رہیں گے۔

رحیم : (تشویشناک لہجے میں) ریشما جو ہم نے عامر کی پڑھائی کے لئے قرض لیا تھا وہ کیسے ادا ہوگا؟ اِدھر میری طبیعت بھی کئی ماہ سے خراب چل رہی ہے۔ ریشما! اب میرے ہاتھ پیر میں پہلے جیسی طاقت نہیں ہے۔

ریشما : میرے سرتاج، آپ بے فکر رہئے، خدا پر بھروسہ رکھئے، آپ چند دن گھر پر آرام کیجئے، تب ڈیوٹی پر جایئے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

(اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ اسی اثنا میں عامر نے فوزیہ سے شادی بھی کر لی اور چند دن بعد عامر کی نوکری بھی ہو گئی، لیکن شادی اور نوکری کی خبر ماں باپ کو نہیں دی۔ قرض دینے والے رحیم کو قرض ادا کرنے کے لئے سختی کرنے لگے۔ قرض دینے والوں میں سے ایک نے کہا۔ بھائی رحیم! تمہارے لڑکے عامر سے میں نے قرض ادا کرنے کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ آپ نے جس شخص کو قرض دیا ہے اسی سے وصول کیجئے۔ (یہ سن کر رحیم کا کلیجہ پھٹ گیا۔)

(چند دن بعد)

(رحیم جب کارخانہ پہنچا تو کارخانہ کے منیجر نے کہا)

منیجر : رحیم! اگر تم پہلے جیسی محنت نہ کرو گے تو قرض کی رقم کریم

چاچا کی تنخواہ سے کاٹ لی جائے گی...... یہ لو نوٹس......

(نوٹس ہاتھ میں لے کر رحیم جوں ہی آفس سے باہر آیا فوراً لپک کر اس نوٹس کو کریم چاچا نے لے لیا)

کریم : رحیم بیٹا! تو اس نوٹس کی فکر مت کر......تو جا اور چند دن آرام کر......پھر کام پر آنا۔

رحیم : (گودام کی جانب جاتے ہوئے) نہیں چاچا مجھے آرام نہیں چاہئے۔ مجھے روپیوں کی ضرورت ہے اور روپے کے لئے کام کرنا ضروری ہے۔

(کارخانہ کے گودام میں پہنچ کر وہ ایک بورا اُٹھا کر ٹرک میں چڑھانے لگا، اسی وقت اس کا پیر ڈگمگایا اور وہ زمین پر چاروں خانے چت گر گیا۔ رحیم کے سینے پر بورا گرا اور اس کے سر اور ناک سے خون بہنے لگا۔ کارخانہ کے مزدور رحیم کی جانب دوڑ پڑے۔ اسے کسی طرح اُٹھا کر اسپتال پہنچایا۔)

-----پردہ گرتا ہے-----

پانچواں منظر

مقام : اسپتال

وقت : گیارہ بجے دن

(سرکاری اسپتال جہاں نرسیں، ڈاکٹر اور وارڈ مین اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ چند مریضوں کی تکلیف دہ آوازیں بھی کانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ ریشما اسی وقت روتے ہوئے ننگے پاؤں اسپتال پہنچتی ہے۔)

کریم : (ہچکی لیتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب! میرے بچے کو بچا لیجئے۔ اس کے علاج میں جتنی بھی رقم خرچ ہوگی، میں اپنا جھونپڑا فروخت کر کے ادا کروں گا۔

ریشما : ڈاکٹر صاحب! ان کو......

ڈاکٹر : کریم چاچا! تمام دوائیاں اور کوششیں بے کار ہو چکی ہیں۔ اب یہ چند منٹوں کا مہمان ہے......(اتنا کہتے ہوئے ڈاکٹر بھی نم دیدہ ہو گیا)

کریم : (گڑگڑاتے ہوئے) نہیں......نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا مت کہئے۔ اللہ کے واسطے اس کا پھر سے معائنہ کیجئے۔

ڈاکٹر : کریم چاچا! میں مجبور ہوں، رحیم کا دماغ ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ اس کا بچنا مشکل ہے۔ آگے اللہ کی مرضی۔ میں نے انجکشن دیا ہے۔ ہوسکتا ہے ابھی چند منٹ کے لئے ہوش آ جائے۔ آپ سب رشتہ دار مل لیں اور اس سے جو بھی ضروری باتیں ہیں، کرلیں۔

(ریشما ڈاکٹر کی بات سن کر زار و قطار رونے لگی۔ ریشما کے رونے کی آواز سن کر فیکٹری کے مزدور رحیم کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ سب ہی لوگوں کی نگاہیں رحیم کے چہرے پر تھیں۔ تھوڑی دیر بعد رحیم کو ہوش آیا تو اس نے کریم چاچا اور ریشما کو اشارہ سے اپنے نزدیک بلایا)

رحیم : (کمزور آواز میں) کریم چاچا......عامر......کہاں ہے؟

کریم : (روتے ہوئے) بیٹا رحیم، اسے خبر کر دی گئی ہے، لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔

(اسی وقت فیکٹری مالک ڈاکٹر کے ساتھ رحیم کا پھر سے معائنہ کرانے کے لئے آئے)

ڈاکٹر : (فیکٹری کے مالک سے دبی زبان میں) افسوس......اب یہ صرف چند منٹوں کا مہمان ہے۔

مالک : (آنسو پونچھتے ہوئے) ریشما، کریم چاچا، اب......اب (ریشما جو رحیم کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی، رحیم اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے)

رحیم : (کمزور آواز میں) ریشما......میں عامر سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اسے جلد بلاؤ۔

ریشما : (اپنا سر ہلاتے ہوئے) میرے سرتاج، میں نے اسے دو مرتبہ بلوا بھیجا، لیکن وہ آنے سے انکار کر گیا۔

(یہ سن کر رحیم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے کریم چاچا کو اپنے نزدیک بلا کر کہا)

رحیم : کریم چاچا میرے مرنے کے بعد ریشما کی دیکھ بھال آپ ہی کو کرنا ہے۔ اب آپ کے علاوہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔

کریم : (روتے ہوئے) ایسا مت کہو بیٹا! تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔
(رحیم نے فیکٹری کے مالک کو اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کیا)

رحیم : میرے مالک آپ کا قرض چکائے بغیر ہی اس دنیا سے جا رہا ہوں، مجھے معاف کرنا۔

مالک : رحیم بیٹا! ایسی باتوں سے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں وہ قرض دل و جان سے معاف کر چکا ہوں۔

رحیم : (کمزور آواز میں) مالک! میری ایک آخری خواہش ہے۔ اگر آپ پورا کر دیں تو میں اطمینان سے مر سکوں گا۔

مالک : کیا خواہش ہے رحیم بیٹے؟ میں اسے ضرور پورا کروں گا۔

رحیم : مالک......آپ جانتے ہی ہیں کہ میں نے عامر کو پڑھانے کے لئے بہت سارے لوگوں سے قرض لیا ہے۔ میرے بعد وہ تمام قرض دینے والے ریشما پر ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ بیچاری کہاں سے ادا کرے گی؟ اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ ہماری فیکٹری میں جو کلرک کی جگہ خالی ہے اسے ریشما کو دے دیں، تا کہ اس سے اس کا گزارا بھی ہو اور رفتہ رفتہ دوسروں کا قرض بھی ادا ہو جائے۔ آپ وعدہ کریں مالک......!

مالک : بیٹا! تم مطمئن رہو، ایسا ہی ہوگا۔
(رحیم نے پھر ریشما کو قریب بلایا، اس کا دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا)

رحیم : مجھے معاف کر دو ریشما۔ سب مرنے والے جائداد چھوڑ کر جاتے ہیں، لیکن میں......تمہارے سر پر قرض کا بوجھ......
(پھر وہ تمام لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں اب بھی عامر کو ہی تلاش کر رہی تھیں، پھر آنکھیں بند کر کے دھیرے دھیرے کلمہ پڑھنے لگا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اسپتال میں آہ و بکا کی صدا گونج اٹھی۔ ریشما دیوانوں کی طرح رحیم کے مردہ جسم سے لپٹ کر رونے لگی۔ اسی وقت فیکٹری مالک عامر کو ساتھ لئے اسپتال میں داخل ہوا۔ ریشما کی نظر جیسے ہی عامر پر پڑی وہ زخمی شیرنی کی طرح اسے گھورنے لگی۔)

ریشما : (گرج کر) خبردار! اگر تو نے میرے شوہر کی لاش کو ہاتھ لگایا تو اس کا انجام برا ہوگا۔ تجھ جیسے نالائق کی پرچھائیں میں اپنے شوہر کی میت پر نہیں پڑنے دوں گی۔

عامر : (گڑگڑاتے ہوئے) ماں! مجھے معاف......!

ریشما : (ریشما عامر کی یہ بات سن کر پاگلوں کی طرح قہقہہ لگانے لگی) معاف کر دو! معاف کر دو......؟ کیا میں اپنے شوہر کے قاتل کو معاف کر دوں، ہرگز نہیں۔
(پھر ریشما نے غصہ میں اٹھ کر عامر کا ہاتھ پکڑ کر اسپتال سے باہر نکال دیا اور خاموشی کے ساتھ شوہر کی لاش کے سرہانے سر جھکائے بیٹھ گئی۔

......پردہ گرتا ہے......

❁❁❁

کہانی کار نہیں، شعبدے باز

کہانی کے میدان میں کچھ نئے لوگ آئے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر نئی نسل کے ہیں، لیکن دراصل اپنے جیسے ہیں، بالکل ایسے ہی کپڑے پہنتے ہیں، اسی طرح شیو کرتے ہیں، اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جس میں ہم کرتے ہیں، اسی طرح روزی روٹی اور ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں تنظیم ہے، ترتیب ہے، ابلاغ ہے، مقصد ہے، کوئی منزل ہے، جادہ ہے اور اگر کہیں پر کچھ نہیں ہے تو ادب کے میدان میں نہیں ہے۔ وہ ادب میں کسی مقصد کے قائل نہیں، آپ جب اُن سے بات کریں گے تو اُن کی گفتگو بالکل ٹھیک ٹھیک آپ کی سمجھ میں آ جائے گی، مگر جب یہ کہانی لکھیں گے تو آپ کے پلے کچھ نہیں پڑے گا سوائے ایک مجہول چیستاں کے۔ وہ کافی ہاؤس جانے کا راستہ جانتے ہیں، مگر اپنی کہانی کا راستہ انہیں معلوم۔ انہیں اپنی ملازمت کا مقصد معلوم ہے، اپنی کہانی کا نہیں۔ جب وہ اپنے گھر جاتے ہیں تو دو ٹانگوں کے سہارے قدم اُٹھائے ہوئے جاتے ہیں، مگر اپنی کہانی میں سر کے بل رینگتے ہیں اور اسے آرٹ کہتے ہیں۔ میں انہیں کہانی کار نہیں کہتا شعبدے باز کہتا ہوں۔ (کرشن چندر کی تحریر، مشمولہ ماہنامہ ''کردار''، مظفر پور، اپریل، مئی ۱۹۷۱ء، ص۱۲ سے ماخوذ)

منظومات

اقصیٰ نوری
Khara Kuan, Gulzarbagh, Patna - 800007

مناجات

یارب تو معبود ہمارا
بس تو ہے مقصود ہمارا
دنیا تو ہے ، عقبیٰ تو ہے
ملجا تو ہے ، ماویٰ تو ہے
تو ہی مالک ، تو ہی خالق
تو ہی قادر ، تو ہی صادق
آئے ہیں ہم دَر پر تیرے
دنیا بھر کے غم ہیں گھیرے
ہم پر یہ احسان خدا کر
سجدے کی توفیق عطا کر
دل بہلائیں قرآں سے ہم
سارے غم ہوں درہم برہم
روزی سب کو دیتا تو ہے
سب کی کشتی کھیتا تو ہے
ہم ہیں یارب ناداں بندے
عصیاں کے ہیں پاؤں میں پھندے
کرتے ہیں ہم ماں کی خدمت
ان کے قدموں میں ہے جنت
ابو بھی ہیں شفقت والے
ہمت والے ، رحمت والے
رحمت فرما ان دونوں پر
عرضی سن لے پیارے داور
لے چل ہم کو سیدھا رستہ
تن ہے لاغر ، جاں ہے خستہ
آساں ہم پر منزل کردے
رحمت سے دامن کو بھر دے
یارب اتنی عرضی سن لے
جو تیری ہے مرضی سن لے

توبہ ہونٹوں پر ہے جاری
ایماں پر ہو موت ہماری

❀❀❀

فردوس گیاوی

Arif Nagar, Gewal Bigha, Gaya - 823001
(Mob. 9546037777)

بیٹیاں

کرتی ہیں پورا سب کا ہی ارمان بیٹیاں
گھر کے لئے تو ہوتی ہیں پہچان بیٹیاں
جس گھر میں بیٹیاں ہیں ، برستی ہیں رحمتیں
ان کو نہ بوجھ سمجھیں کہ ہیں شان بیٹیاں
سیتا بھی ایک بیٹی تھی مریم بھی دوستو
سب مشکلوں کو کرتی ہیں آسان بیٹیاں
ان کو بھی احترام کی نظروں سے دیکھئے
کب تک کریں گی وقت کا سمان بیٹیاں
ماں کے قدم کے نیچے ہیں جنت کی راحتیں
گھر کے لئے تو ہوتی ہیں وردان بیٹیاں
سرکار کہہ رہی ہے کہ بیٹی بچایئے
پڑھ لکھ کے ہوں دیکھنا دھنوان بیٹیاں
فردوسؔ ان سے دل کو میسر سکون ہے
کرتی نہیں کبھی بھی پریشان بیٹیاں

❁❁❁

منورؔ داناپوری

Shah Toli, Danapur Cantt. Patna - 801503
(Mob. 8789946411)

خداداد

متاعِ سخن ہے خدا داد اے دوست
ترا علم و فن ہے خدا داد اے دوست
تو بزمِ ادب کا چراغِ سخن ہے
تری انجمن ہے خدا داد اے دوست
ترے علم و فن سے ہو روشن زمانہ
تری فکر وفن ہے خدا داد اے دوست
خزاں کیسے آئے گی گلشن میں تیرے
بہارِ چمن ہے خدا داد اے دوست
کواکب جو ہیں آسمانِ ادب پر
انہیں کا گگن ہے خدا داد اے دوست
تو ہی عقل و دانش ، تو ہی فکر وفن کا
مکمل وطن ہے خدا داد اے دوست
منور رہی ہے ، منور رہے گی
جو بھی انجمن ہے خدا داد اے دوست

❁❁❁

مرغوب آثر فاطمی

Road No. 7, Mohalla Ali Ganj, Gaya - 823001 (Mob. 9431448749)

غزلیں

ترکِ مفاد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں
کشت فساد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

ناقدریٔ جہت سے پاتا فروغ ''کمتر''
''بہتر'' کو داد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

دعوائے منصفی اور طرزِ قرونِ وسطیٰ
اتنا تضاد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

ہیں منتظر مواقع ، ہے کیا عجب کہ پھر بھی
ہم نا مراد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

ہر سو بلند ہوتے ، اپنوں کے خوں کی خاطر
طبل مناد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

تہہ میں نوازشوں کے سیل رواں میں پنہاں
بغض و عناد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

مصنوعی عقلیت کی تابش پہ کیوں ہے بھاری
دل کا سواد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

بازارِ فہم میں ہے افراط کا کرشمہ
پھر بھی کساد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

سارے بدن میں ٹھوکر کھاتا آثر ترا دل
فکر مواد ، وہ بھی اِکیسویں صدی میں

❁❁❁

رِندی میں جام و مینا و ساغر میں جاں نہیں
مائل بہ التفات جو پیر مغاں نہیں

دل کے معاملات کی کس کو ہوا لگے
اک آتش نہفتہ ہے جس میں دھواں نہیں

کیا جائیے چمن میں کہ صورت بدل گئی
زنجیریں شرمسار ہیں ، آہ و فغاں نہیں

تبدیلیٔ لسان پہ کہنا پڑا مجھے
یہ تو حضور آپ کا طرزِ بیاں نہیں

کیوں کر سمجھ رہے ہیں غلط فہمیوں میں ہم
جو داؤ پر لگا ہے وہ نام و نشاں نہیں

سب کو سمیٹ کر ہے مسلسل رواں دواں
کہتے ہیں جس کو اردو وہ کس کی زباں نہیں

دم سے مرے چمکتا رہے آسمان شوق
''اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں''

رگ رگ میں تلخیاں ہیں زمانے کی موجزن
پژمردہ پھر بھی اپنا مذاقِ گماں نہیں

نکھرا تری غزل میں آثر حسن کا بھی حسن
ویسے تو شعریات کا تیور کہاں نہیں

❁❁❁

غزلیں

نذر فاطمی

Flat No. 201, Alnoor Mention, Haron Nagar, Patna - 801505 (Mob. 9771222617)

ہوا گرم ہے ، اس کی رفتار مشکل
بچانا ہوا اب کے دستار مشکل

اکیلا تو میں ہی نہ تھا امتحاں میں
سوالات کیوں رکھے اس بار مشکل

ہوا ہے مصاحب وہ جب سے شہا کا
سر راہ ہے اس کا دیدار مشکل

شکستہ دلوں کو بھی کیا عذر ہوگا
نہ انکار مشکل ، نہ اقرار مشکل

تلاش صنم میں جو صحرا میں بھٹکا
اسے کیا تھی محلوں کی دیوار مشکل

ادب پاروں میں ہے تری نذر شرکت
بھلا دیں ترے لوگ اشعار ، شکل

❁❁❁

ڈاکٹر وصی الحق وصی

At+P.o.- Banithu, Dist.- Sant Kabir Nagar- 272152

سوادِ جاں میں عجب دائرہ بناتا ہوا
گزر گیا ہے کوئی حادثہ رُلاتا ہوا

بڑا حسین سا لگتا ہے خیمۂ شب میں
ہجومِ ابر میں مہتاب مسکراتا ہوا

سفید چاندنی بکھری تھی اس کے عارض پر
کوئی چراغ تھا آنکھوں میں جھلملاتا ہوا

یہ خوف بھی ہے کہیں شہر دل کا سناٹا
نہ آئے میری طرف دست و پا بڑھاتا ہوا

اُلجھ رہا ہے وہ اپنے وجود کی خاطر
حصارِ موج میں اک عکس تھرتھراتا ہوا

سمجھ لیا کسی طوفاں کو قافلہ میں نے
نظر جو آیا کہیں گردِ رہ اُڑاتا ہوا

قیامتیں کئی دیکھی ہیں ، وہ بھی دیکھیں گے
ہر ایک شخص ابھی سے ہے کیوں ڈراتا ہوا

بڑا عجیب تھا منظر وصی حویلی کا
ہر ایک سنگ نئی داستاں سناتا ہوا

❁❁❁

اویناش امن

Kali Mandir Road, Hanuman Nagar, Patna - 800026

(Mob. 7870678786)

غزلیں

گلستاں میں جس طرح سے ہو کوئی کھلتا گلاب
آپ کا چہرہ جو دیکھا ، یوں لگا دیکھا گلاب

زندگی خوشبو سے اس کی ہے معطر روز و شب
یاد ہے وہ زندگی کا آج بھی پہلا گلاب

دل سے یہ حسرت ہمارے تا عدم نکلی نہیں
ہم کو بھی اے کاش کوئی پیار سے دیتا گلاب

زندگی کی آزمائش سے نہ تھک جانا کہیں
خار کے دامن میں ہی ہوتا ہے پوشیدہ گلاب

آج کن آنکھوں سے ہائے یہ نظارہ دیکھئے
منتشر ہے پنکھڑی اور دھول میں لپٹا گلاب

کھو گیا وہ زیست کا جانے کہاں آوارجہ
جس کے پنوں میں دبا رکھا تھا اک سوکھا گلاب

آپ اپنے دل کا دروازہ ذرا تو کھولئے
منتظر ہوں اپنے ہاتھوں میں لئے تازہ گلاب

گلستاں میں لاکھ ہیں گلکاریاں ، نیرنگیاں
سارے پھولوں میں ہے،لیکن امن بس اچھا گلاب

❁❁❁

اک طرف دلکش نظارے ، حسن تیرا اک طرف
اک طرف شمس و قمر ہیں اور ستارا اک طرف

اک طرف اٹکھیلیاں کرتی ندی کہسار سے
اک طرف پربت کی چوٹی ، دشت وصحرا اک طرف

آسماں سے بات کرتے اک طرف اشجار ہیں
اور اُترتا گھاٹیوں میں عکس گہرا اک طرف

اک طرف رنگین پھولوں سے معطر وادیاں
رنگ زلفوں کا تمہاری ہے سنہرا اک طرف

اک طرف ہے قافیہ پیمائی کا بازار گرم
سرد ہوتی موجِ امکانِ نظارہ اک طرف

اک طرف مایوس لوگوں کا ہجوم بے پناہ
قہقہہ بر دوش خوش آئند خیرا اک طرف

اک طرف ہے حلقہ زنجیر سا کستا ہوا
امن میری آنکھوں میں روشن سویرا اک طرف

❁❁❁

طلحہ تابش

Sahaudarpur West, Station Road, Pratapgar - 230001 (Mob. 9044676517)

غزلیں

انسان زندگی میں کبھی خوار ہی نہ ہو
گر دل کی خواہشات کا اظہار ہی نہ ہو

وہ موسم بہار کا حقدار ہی نہ ہو
گلزار جس کے دم سے چمن زار ہی نہ ہو

شاید تمہیں ہو اس کی خبر ، مجھ کو تو نہیں
دنیا کی لذتوں سے جسے پیار ہی نہ ہو

کیوں اس کی زندگی نہ ہو دشوار پھر بھلا
راہوں میں جس بشر کی کوئی خار ہی نہ ہو

پھر دل کی کیفیت کو کوئی جان کیا سکے
چہرے سے درد کا اگر اظہار ہی نہ ہو

گلشن کے حسن میں نہ ہو محسوس کیوں کمی
شاخوں پہ گل کے ساتھ اگر خار ہی نہ ہو

قسمت کا کھیل دیکھئے تابش کہ بار بار
گزرا ہوں آس لے کے اور دیدار ہی نہ ہو

❀❀❀

ہے وہی اب فکر میں اکرام کی
چاہ جس کو کل نہ تھی انعام کی

بارشیں دنیا نے کی الزام کی
آپ نے سوغات دی دشنام کی

ہم چراغوں کی طرح جلتے رہیں
روشنی پھیلے گی تیرے نام کی

اس نے بخشا ہے نظام میکدہ
مجھ کو تو حاجت تھی بس اک جام کی

دشمنوں کو آج کل کیا ہوگیا
کرتے ہیں تشہیر میرے نام کی

دل میں ہے تیری نگاہوں کا سرور
کیا ضرورت ہے کسی بھی جام کی

پھوس کے گھر میں ہے تابش کو سکون
دل سے حسرت جاچکی ہے بام کی

❀❀❀

تلمیحاتِ آتش

باغ و بہار آتش نمرود کو کیا
مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا

موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی
فرعوں کو تو نے غرق کیا رودِ نیل کا

طوفاں میں ناخدائی کی کشتیٔ نوح کی
حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیوں تخت سلیماں مانگوں

فصیح احمد ساحرؔ

71, Acharya Prafulla Chandra Roy Road, Kolkata-700009 (9748193053)

غزلیں

ہمارے قیمتی لمحوں کو یوں برباد کرتے ہیں
وہ اپنی زندگی کی پیش جب روداد کرتے ہیں

ہمیں افسوس ہے کہ قید میں رکھا ہے مدت سے
نکل جاؤ پرندو! ہم تمہیں آزاد کرتے ہیں

کسی مومن کا یہ کردار تو ہو ہی نہیں سکتا
فریب و مکر والے کام تو صیاد کرتے ہیں

عجب ہے زندگی جنت بنانے میں بسر کردی
وہ کارِ رائیگاں بھی آج کے شداد کرتے ہیں

فقط میری نہیں یہ آج گھر گھر کی کہانی ہے
جو بیٹے کر نہیں پاتے وہ اب داماد کرتے ہیں

خدا ان کی خطائیں درگزر کر دیتا ہے ساحرؔ
ہمیشہ اشک بار آنکھوں سے جو فریاد کرتے ہیں

❀❀❀

آرزوؤں کا ہر اک پیکر یہاں شیشے کا ہے
لوگ تو پتھر کے ہیں ، لیکن مکاں شیشے کا ہے

چند لمحوں کی رفاقت کو غنیمت جانئے
مت بھروسہ کیجئے یہ جسم و جاں شیشے کا ہے

عزم مستحکم مرا چٹان کی مانند ہے
گردشِ ایام تیرا ہر گماں شیشے کا ہے

کب تلک کوئی حصارِ بے پناہی میں رہے
سنگ باری دھوپ کی ہے ، سائباں شیشے کا ہے

ایک ہی بستر پہ ہم دونوں رہے ہیں اجنبی
یہ حصارِ سخت لیکن درمیاں شیشے کا ہے

ایک ہی آواز میں ساحرؔ فنا ہو جائیں گے
یہ زمیں شیشے کی ہے یہ آسماں شیشے کا ہے

❀❀❀

اشعار زیبا

بھری محفل میں ہر اک سے بچا کر
تری آنکھوں نے مجھ سے بات کر لی (فراقؔ گورکھپوری)

آدابِ جنوں مانگے ، آئین وفا مانگے
کیا دل ہے کہ اک دنیا ، دنیا سے جدا مانگے (شمیم کرہانی)

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیٔ ایام بھی پی ہے (مخدوم محی الدین)

شکریہ آپ کی گائی ہوئی خاموشی کا
ہوش رہ کے مزا آگیا مدہوشی کا (قتیلؔ شفائی)

دل میں اک شوق کا طوفان بپا رہنے دے
اپنا سر تو مرے شانے پہ جھکا رہنے دے (جان نثار اخترؔ)

جب آپ خود ہی اپنی ادائیں نہ گن سکے
میں داغ ہائے دل کا کروں کس طرح شمار (مظہر امامؔ)

اس دور میں اے عاجزؔ کیا ذکر محبت کا
اک دفترِ گم گشتہ ، اک قصۂ پارینہ (کلیم عاجزؔ)

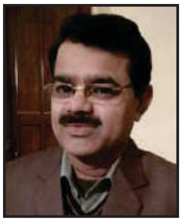

رہبرؔ گیاوی

Book Emporium, Sabzibagh, Patna - 800004 (Mob. 9334754862)

غزلیں

روایت سے بغاوت کر رہا ہوں
زمانے سے محبت کر رہا ہوں
مرا دشمن مجھے بھولے گا کیسے
اسی کی میں حمایت کر رہا ہوں
جو تم چاہو تو سولی پر چڑھادو
بیاں میں پھر حقیقت کر رہا ہوں
یہ شہر سنگ ہے جرأت تو دیکھو
میں شیشے کی تجارت کر رہا ہوں
دوانے پھر رہے ہیں لے کے پتھر
میں شیشے کی حفاظت کر رہا ہوں
ابھی تو وقت ہے آنکھیں بھی کھولو
تمہیں میں کچھ ہدایت کر رہا ہوں
مرے اشعار سے مجھ کو نہ تولو
تمہاری میں قیادت کر رہا ہوں

❁❁❁

اگرچہ جان ارزانی بہت ہے
طبیعت پھر بھی جولانی بہت ہے
ترس کیوں آگئی حالت پہ میری
مرا دشمن تو وہ جانی بہت ہے
مجھے کیوں چھوڑ ڈالا رہزنوں نے
مرے بھائی کو حیرانی بہت ہے
نہ چھلکایا کسی موقع پہ میں نے
مری آنکھوں میں بھی پانی بہت ہے
نہیں پیچھے کسی بھی شہر سے یہ
مرے گاؤں میں عریانی بہت ہے
تمہاری یاد کے سائے ہیں گھر میں
نظر آتی تو ویرانی بہت ہے
اے رہبرؔ راہ میں رکنا نہ ہرگز
بلا سے بادِ طوفانی بہت ہے

❁❁❁

مطالع مومنؔ

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

ہو گئی گھر میں خبر ہے منع واں جانا ہمیں
وہ بھی رسوا ہو خدا جس نے کیا رسوا ہمیں

تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب
وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب

شوق کم ملنے سے اندوہ فزا ہوتا ہے
ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے

غزل

جمالؔ کاکوی
"Kako House" Alamganj,
Patna - 800007
(Mob. 7870662357)

بہت دنوں تک زمیں کے اوپر، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے
لباس فاخر ، کلاہ سر پر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

بنا رہے ہو جو گھر شہانہ ، کہاں رہے گا یہ دن سہانا
نفیس مخمل کا نرم بستر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

تمام دنیا جہان فانی ہے ، چار دن کی کوئی کہانی
دکھانے والے یہ رنگ تیور ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

یہ جانتا ہے ہر ایک دانا ، تمام بکھرے گا تانا بانا
تباہ ہونا لکھا مقدر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

کمال کا ہے نظام سارا ، زمیں کا چکر ، وہ چاند تارا
لگے گا دل پر یہ سن کے نشتر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

تمام جھگڑے یہ تیرے میرے ،جو بند آنکھیں تو گھپ اندھیرے
حسیں نظارے ، نہ ماہ پیکر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

یہ ختم ہوگا سبھی تماشہ ، بتا رہا ہوں سنو خلاصہ
نہ رات دن ، نہ وہ ماہ اختر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

ہے چار دن کی یہ زندگانی ، زمیں رہے گی ، ہوا نہ پانی
نہ دور دورہ ، نہ لاؤ لشکر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

وہی جو ہے جسم و جاں کا مالک ، وہی جو سارے جہاں کا مالک
اسی کا جلوہ ، اسی کا جوہر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

سنو سنو یہ جمالؔ بانی ، یہ چاہ دنیا ، یہ جاں فشانی
ملے گا دنیا پہ خاک مرکر ، نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے

❁❁❁

نام کتاب	:	سمندر پر ایک اُڑان		
مصنف	:	اختر واصف		
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی		
صفحات	:	۱۴۴	قیمت :	۲۵۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر آصف سلیم		

''سمندر پر ایک اُڑان'' اختر واصف کے پندرہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے اور اس میں مشمولہ تمام افسانوں کا عالم یہ ہے کہ وہ دوران مطالعہ اپنے موضوع و مطالب کے اعتبار سے اپنے گردوپیش کے معاشرہ وسماج سے فن کار کی گہری وابستگی کا راست ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اختر واصف ۱۹۸۰ء کے بعد کی اردو افسانہ نگاروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور افسانے تحریر کرنے کے عمل میں خاصے سرگرم رہے ہیں، مگر نہ جانے کیوں طویل دنوں تک یک گونہ خاموشی انہوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ خیر سے ''سمندر پر ایک اُڑان'' کے ساتھ اپنی تازہ کاری کا انہوں نے خوب سامان کیا ہے۔ نام کتاب مع تصاویر دیکھنے پر افسانہ نگار کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے جس کے شواہد ان کے افسانوں کے مطالعے کے دوران جا بجا ہمارے ملاحظے میں آتے ہیں۔ سمندر پر اُڑان عین پر خطر ہے، مگر حوصلہ مندوں کی نگاہوں میں بصورت رکاوٹ اس کا اصلاً کوئی عذر و کردار نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک اکیلی ناؤ کی سرورق پر شمولیت تو قابل دید بھی ہے اور بامعنی بھی۔ اختر واصف کے زیر نظر مجموعہ کے تقریباً سبھی افسانے ترسیل کے اعتبار سے بہ آسانی فہم کا حصہ بن جاتے ہیں اور ماجرا نگاری کے دلچسپ التزام کے واسطے سے قاری کی توجہ برقرار رکھنے کے اہل معلوم ہوتے ہیں۔

ان کے افسانوں کی مختصراً واقفیت کی غرض سے ان کے چند افسانوں کے احوال سے وابستگی بہرحال ضروری ہے جہاں اس جہان میں اپنے روز و شب بسر کرنے والوں سے متعلق بڑے اہم اور سنجیدہ موضوعات جلوہ گر ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ بنام ''ہاتھ'' تحریر کیا گیا ہے جہاں دکھ والم کی گھڑی میں پہلے تو سماج کی بے اعتنائیوں کی بات کی گئی ہے، مگر پھر تدارک کی لازمیت کا سامان کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اسکوٹر والا ایک تیز رفتار جیپ کی ٹکر سے زخمی ہو گیا اور اسپتال لے جانے کی خاطر بھیڑ میں ٹال مٹول کی صورت حال ہے۔ ایسے میں دفتر میں کام کرنے والے مشتاق صاحب ہیں جن کے اندر ضمیر زندہ ہے، جو زمانے کی گمرہی کا شکار تو ہوتے ہیں، مگر انسانی دردمندی کے آخرش ہم نوا بن کر زخمی شخص کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے اسپتال جانے کے ساتھ ساتھ دفتر جانے کے راستے میں ایک گرے ہوئے مکان کا ملبہ ہٹانے والوں میں بھی شامل ہو جاتے ہیں جس کے اندر ایک آدمی کے دبے ہونے کی بات کہی جا رہی تھی۔

اختر واصف کا افسانہ ''کچھ الم غلم چیزیں'' ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں یو۔ کے نیشنل ایک کامیاب بزنس مین کا ناسٹیلجیا اس کے عہد گزشتہ سے وابستگی کے توسط سے بیان ہوتا دکھائی دیتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب وہ اپنی مصروفیت کم کرتا ہے اور دل کے نہاں خانوں میں بنام ترک شدہ فالتو چیزوں کی جانب اپنی توجہ مبذول کرتا ہے۔ یہ افسانہ میں اور اس کے بھائی کلیم الرحمٰن کے ساتھ بڑے ماموں کے اہم کردار کے سہارے تحریر کیا گیا ہے جو اچھے دنوں کے بعد حال کے دنوں میں تنگیٔ حالات سے دوچار تھے۔ کلیم الرحمٰن ان کی مدد کا خواہاں ہے، مگر بڑے ماموں کی جانب سے پیسے لینے سے انکار کی بات تنگ دستی میں بھی ان کی خودداری کے رویے کو بخوبی اجاگر کرتی ہے جو سبق آموز ہے۔

''فرد بیان'' افسانہ کی کیفیت یہ ہے کہ یہ برے کام کا برا انجام والے تصور کے پیش نظر تحریر کیا گیا ہے۔ یہاں ایک بوڑھے کوڑھی کا مستحسن عمل یہ ہے کہ وہ ایک لاوارث کو کھنڈر کے ایک کمرہ میں پناہ دیتا

ہے اور اس کی کفالت کرتا ہے، مگر بڈھے کی موت کے بعد اس کا پرورش کردہ وہ بچہ بڑا ہوکر اس جہان کی جملہ بداعمالیوں اور بدعنوانیوں میں ملوث ہوجانے کی پاداش میں اسی موذی مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے اور ڈاکٹر سے یہ التجا کرتا ہے کہ وہ اسے انجکشن لگا کر ہمیشہ کے لئے سلا دے۔سوچئے تو حیاتِ انسانی کی یہ کتنی عبرت انگیز منزل ہے۔

’’کمرہ‘‘ عنوان سے تحریر کیا گیا افسانہ عہد گزشتہ اور عہد حاضر کی قدروں سے ہماری وابستگی کا سامان کرتا ہے جہاں ایک زمانے میں شمیم نامی کردار کا اپنے دوست کے مکان کے ایک کمرے میں قیام رہا تھا اور وہاں کی دیوار پر بہادر شاہ ظفر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مرزا غالبؔ جیسے لوگوں کی تصویریں آویزاں تھیں اور جنہیں اسی صورت میں دیکھنے کی تمنا لئے سفر کی صعوبت جھیل کر وہ اس مقام تک رسائی حاصل کرتا ہے، مگر تبدیلیٔ زمانہ کے زیر اثر اس کے دل پہ کچوکے لگتے ہیں کہ اب تو ماقبل کی ان دیواروں پر باکسر، فلم اسٹار و غیر ملکی کھلاڑیوں کی تصاویر نے مقام لے رکھا تھا۔

’’دوسرے درجے کا ٹکٹ‘‘ طبقاتی تفریق سے متعلق افسانہ ہے جہاں انگریزی عہد اور بعدہٗ اس آزاد ملک کے عہد میں طبقاتی تفریق سے دوچار ایک بوڑھے کے ٹرین کے ڈبے میں سوار ہونے اور اُسے اتارے جانے کے عمل سے موضوع کی خوب وضاحت ہوجاتی ہے۔ بنام ’’آگ‘‘ افسانہ ایک محنت کش مدین رکشہ والے اور پروفیسر اکرام کے مابین گفتگو کی بنیاد پر تحریر کیا گیا ہے جہاں کی بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ مدین کا بیٹا پڑھ لکھ کر ایک دہشت گرد بن جاتا ہے۔

بہ عنوان ’’سمندر پر ایک اُڑان‘‘ افسانہ جو نام کتاب سے بھی نسبت رکھتا ہے، دراصل ایک بے بنیاد اُڑان کے مضر نتائج سے ہمیں باخبر کرتا ہے جہاں ایک شخص اپنے کاروبار کی ترقی میں اپنی بیوی کو شریک کرلیتا ہے اور اس کی بیوی استعمال کی شئے بن کر ترقی کی راہیں کھولتی ہے۔ نشہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک پولیس افسر سے اس کے ناجائز تعلقات قائم ہوجاتے ہیں۔ وہ شوہر سے دور ہوجاتی ہے جس سبب سے وہ اسے ختم کرنے کے درپے ہوجاتا ہے، لیکن پولیس افسر اپنی گولی سے قبل ہی اسے فنا کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ بھوت یہاں اچھا استعارہ ہے

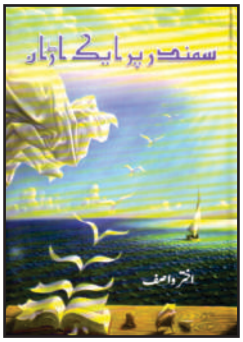

’’دیواریں ہنستی ہیں‘‘ افسانہ کے سلسلے میں جب میں غور وفکر کے مرحلے سے گزرا تو وہاں تقسیم وطن کا منظر اُبھر آیا۔ دیواریں اسی کی علامت ہیں، مگر اس پار اور اس پار والوں کے ناتے داروں کے مابین الفت و محبت کا اٹوٹ رشتہ تو بہرحال قائم و دائم ہے۔ اب اسے بدبختی نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ آج اس دیوار کی منفی معنویت کے زیر اثر پچاس دیواریں ہمارے وجود کے اندر اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں جو حقیقتاً مضر ہیں۔

اس طرح اختر واصف کے زیر نظر مجموعہ ’’سمندر پر ایک اُڑان‘‘ کے افسانوں کے تعلق سے بطور مجموعی میرا یہ خیال ہے کہ یہ دلچسپیوں سے معمور فکر انگیز افسانے ہیں۔ مجھے امید قوی ہے کہ قاری بہ شوق ان کا مطالعہ کریں گے۔

نام کتاب	:	شاہد جمیل: رنگ اور آہنگ
مرتب	:	ڈاکٹر اسلام عشرت
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۴ء صفحات: ۱۳۶
قیمت	:	۲۵۱ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر ممتاز فرخ

ڈاکٹر اسلام عشرت دنیائے اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ درس و تدریس کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ اب بھی پوری طرح فعال اور متحرک ہیں۔ ڈاکٹر عشرت کی تصنیفی زندگی تقریباً چار دہائیوں پر محیط ہے۔ ’’کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار‘‘، ’’خلیل الرحمٰن اعظمی: ترقی پسندی سے جدیدیت تک‘‘ اور ’’جاں نثار اخترؔ شاعر جدید‘‘ کے بعد اب ان کی چوتھی زیر نظر خوبصورت کتاب ’’شاہد جمیل: رنگ اور آہنگ‘‘ سامنے آئی ہے۔ شاہد جمیل کی زندگی اور ادبی خدمات پر مشتمل اس کتاب میں مرتب کے مختصر پیش لفظ کے ساتھ

چودہ مضامین شامل کیئے گئے ہیں۔

شاہد جمیل صاحب معروف ومشہور ادبی شخصیت کے مالک ہیں اور یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ ممدوح کتاب اور مرتب کتاب دونوں نے لگ بھگ ایک ساتھ اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا۔اک نئی صنف ''کہہ مکرنی'' کے حوالے سے ان کا ایک شعری مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔ ''ماہیے اور دوہے'' کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور اس طرح گویا صوبائی سطح پر اس معاملے میں وہ اوّلیت کا مقام رکھتے ہیں۔

شاہد جمیل صاحب مختلف الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن پر اب تک سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کے فکر وفن کے حوالے سے موقر رسالہ ماہنامہ ''سہیل'' گیا اور سہ ماہی ''رنگ'' دھنباد نے خصوصی شمارہ بھی شائع کیا تھا۔شاہد جمیل کے اب تک پانچ شعری مجموعے، ایک شعری انتخاب اور پھر ان کی تین نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔وہ بچوں کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں۔مرتب کتاب ہذا کے مطابق:

''شاہد جمیل ایک نئی شعری صنف 'غزل نما' کے بانی کے طور پر بھی شہرت رکھتے ہیں۔''

ان کی ہیئت اور تقلید میں ''غزل نما'' کے دو مجموعے ''پتھر میں شگاف'' (مشرف حسین محضر، علی گڑھ) اور ''تمہارے ساتھ چلنا ہے'' (ظہیر انور، ممبئی) بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب میں ''شاعر باکمال، دانشور وعقیل: شاہد جمیل'' کے عنوان سے پروفیسر خالد حسین خاں کا مضمون اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ اس میں مضمون نگار نے شاہد جمیل کا تعارف، تذکرہ، خاکہ، شعری مزاج اور تنقیدی رویہ کے حوالے سے بے حد خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک مثال ملاحظہ کریں:

''فکر وفرزانگی، احساس ومردانگی، جذبہ، جبلت، جوش اور جنون شاہد جمیل کے بشری نیز شعری امتیازات ہیں۔ شاہد جمیل ہمہ رنگ اور سب رنگ فنکار اور قلمکار کہے جانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔شخصیت میں شعریت، جاذبیت اور سحریت کی تثلیث دیدنی ہے اور سادگی وشرافت مستزاد! صحافت، شاعری، بچوں کے افسانے، نظمیں اور ناول، سب پر طبع آزمائی کے بعد بالخصوص میدانِ شاعری کو اپنا ہدف وحرز جاں بنایا اور اسی میں مسلسل چاند ماری کر رہے ہیں۔'' (شاہد جمیل: رنگ اور آہنگ، ص ۱۸)

''موسم کی رفتار: شاہد جمیل کے فن کا اعجاز'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے عشرت ظہیر نے شاہد جمیل کے دوہوں پر اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔انہوں نے اسلوب واظہار کی جدت، لہجے کی برجستگی، موضوعی تنوع اور فن پر مضبوط گرفت کے اعتبار سے ''موسم کی رفتار'' کو قابل مطالعہ اور لائق تحسین مجموعہ ٹھہرایا ہے۔اس کتاب میں نذیر فتح پوری کا ایک مضمون شانؔ بھارتی کی کتاب ''شاہد جمیل: ذکر وفکر'' بھی شامل ہے۔ سہ ماہی ادبی رسالہ ''رنگ'' شاہد جمیل کے فکر وفن پر تحریر کردہ اہم ادبی شخصیات کے مضامین کا مجموعہ ہے، جسے شان بھارتی نے ترتیب دیا ہے۔انہوں نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ شاہد جمیل اردو ادب میں ایک معروف نام ہے، ایسا نام جس نے غزل سے لے کر کہہ مکرنی اور کہہ مکرنی سے دوہے تک کا سفر بڑی شان سے طے کیا ہے۔

''ادب اطفال میں شاہد جمیل کا مقام'' کے عنوان سے رفیع حیدر انجم نے اپنے مضمون میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ شاہد جمیل نے بچوں کے لیے بھی لکھا ہے۔کہانیوں کا ایک مجموعہ ''سرخ آنکھ'' اور دوسرا جاسوسی ناول ''آدم خور انسان'' مزید برآں انہوں نے بچوں کے لیے حمد، نعت، سلام اور مناجات کے علاوہ دیگر موضوعات پر سو سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں۔وہ نظم ونثر دونوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''روشنی کی شہزادی'' بھی شائع ہو چکا ہے۔زیر نظر کتاب میں عشرت ظہیر کا ایک اور مضمون ''کرونا سے متعلق شاہد جمیل کی دو نظمیں'' بھی شامل ہے جس میں نظم ''رقص کرونا'' اور نظم ''۲۰۲۰ء کی عید'' پر بہترین انداز سے تجزیاتی نظر ڈالی گئی ہے۔

رفیع حیدر انجم کا دوسرا مضمون ''شاہد جمیل: لہجے اور الفاظ: ایک جائزہ'' اس کتاب میں شریک اشاعت ہے جو دراصل ڈاکٹر اشرف النبی قیصر کی شاہد جمیل کے فکر وفن پر ایک مبسوط کتاب کا جائزہ یا تبصرہ ہے۔ شاہد جمیل کے ادبی حوالوں سے مختلف لوگوں کے مضامین ان کی کثیر الجہات شخصیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ رفیع حیدر انجم اس بات کا اظہار کرتے

ہیں کہ شاہد جمیل اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں اور ایسی شخصیتوں کو کسی اور انجمن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شاہد جمیل کی شریک حیات خورشید پروین کا مضمون بہ عنوان ''شاہد جمیل: میرے ہم سفر'' بھی مذکورہ کتاب میں شامل اشاعت ہے۔ انھوں نے اپنا یہ مضمون دلی محبت اور فنکارانہ صداقت کے ساتھ لکھا ہے۔

''شاہد جمیل: جہانِ شاعری کا مینارۂ روشن'' (عکس اندر عکس کے حوالے سے) معراج احمد معراجؔ کا گرانقدر مضمون ہے۔ شاہد جمیل کی فنی خوبیوں اور تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''شاہد جمیل ایک کثیر الجہت قلم کار ہیں۔ وہ بہ یک وقت ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں تو ایک حرف شناس نثر نگار بھی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا ادبی معرکہ 'غزل نما' کی ایجاد ہے۔ یہ ان کا ایک کامیاب تجربہ ہے کیوں کہ لوگوں نے اس صنف سخن کو رد نہیں کیا بلکہ اسے اعتراف کے سند عطا کی۔ کئی شاعروں نے اس صنف کو برتا اور غزل نما کے مجموعے بھی منظر عام پر آئے۔''

(شاہد جمیل: رنگ اور آہنگ، ص ۶۱)

''موسم کی رفتار: دوہے کا قابل ذکر مجموعہ'' کے عنوان سے لکھے گئے اپنے مضمون میں ایڈوکیٹ توحید اعظم علیگ نے بتایا ہے کہ ۲۰۲۱ء میں اشاعت یافتہ اس مجموعہ سے پہلے دوہے پر خاصی عرق ریزی اور ریسرچ کے بعد ۲۰۰۳ء میں ایک وقیع انتخاب ''دوہا رنگ'' کے نام سے مرتب کیا گیا۔ تھا جس میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی بھی ان کے شریک مدیر تھے۔

''شاہد جمیل کے شعری تنوع'' کے عنوان سے ڈاکٹر علیم الحق مظہری نے اپنے مضمون میں موصوف شاعر کی شعری کائنات کے اختصاص کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاہد جمیل جدید تر اردو شاعری کا ایک منفرد اور معتبر نام ہے۔ شاہد جمیل کے شعری مجموعوں میں ''خوابوں کے ہم سایے''، ''عکس اندر عکس'' اور ''سو ماہیے'' کا اس مضمون میں ڈاکٹر مظہری نے خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔

''شاہد جمیل کے دوہے'' (موسم کی رفتار کے تناظر میں) پر ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی نے شاہد جمیل کے دوہے کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

''شاہد جمیل: شخص اور شاعر'' پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تالیف ہے جو ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب پر کئی لوگوں نے تبصرے لکھے ہیں، لیکن مرتب کتاب نے ان میں سے صرف تین حضرات یعنی حقانی القاسمی، ارمان غازی اور سراج احمد انصاری کے تبصرے کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انعام ناظمی، ڈاکٹر محمد ارمغان ساحلؔ سہسرامی، ڈاکٹر رؤف خیر کی بھی تحریریں زیر نظر کتاب کی رونق میں اضافہ کرتی ہیں۔

آخیر میں مرتب کتاب ڈاکٹر اسلام عشرت نے ایک عنوان ''زاویے'' قائم کر کے مختلف لوگوں کی رائیں شامل کی ہیں۔ ان میں شاربؔ ردولوی، محبوب راہیؔ، نصرت ظہیرؔ، طارق چھتاری، محبوب انورؔ، عشرت ظہیر، شانؔ بھارتی، سلیم انصاری اور الیاس صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اسلام عشرت نے ''مرتب کے قلم سے'' میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کتاب میں کل چودہ مضامین شامل ہیں، جن میں پروفیسر خالد حسین خاں، رفیع حیدر انجم اور معراج احمد معراجؔ کے غیر مطبوعہ مضامین انہیں بصورت مسودہ دستیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ سارے مضامین مختلف رسائل و جرائد سے حاصل کئے گئے ہیں۔

پروفیسر اسلام عشرت نے اپنی اس کتاب کا انتساب اپنے بڑے بھائی اور معتبر افسانہ نگار اکرام فرحت، اپنے وقت کے بے حد ذہین و جامع الکمالات شاعر جمال الدین ساحلؔ اور نویں دہائی کے بہترین نثار ڈاکٹر مظفر حسن ضیائی کے نام کیا ہے۔ یہ تینوں شخصیتیں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ بلیک اینڈ وہائٹ میں فلم اسٹار جیسی شاہد جمیل کی تصویر سے مزین سرورق عمدہ اور پرکشش ہے۔ کاغذ عمدہ، چھپائی دیدہ زیب اور قیمت مناسب ہے۔ اُمید ہے ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی اور باذوق قاری شاہد جمیل کے رنگ و آہنگ سے نئی تازگی کے ساتھ متعارف و مستفید ہوں گے۔

❁❁❁

☆ ''زبان وادب'' مارچ ۲۰۲۵ء کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ! پہلا اور آخری سرورق رنگین اور خوبصورت ہی نہیں بلکہ تصویر کے ساتھ تصانیف اور تحریر کے عکس نے اسے علمی اور دستاویزی بھی بنادیا ہے۔ سرورق اور پس ورق کو بالعموم اس طرح زینت بخشنے کا طریقہ میرے خیال سے بہت ہی اچھا اور مفید طریقہ ہے۔ محترمہ ہما احمد نے اپنے مقالہ ''فصیح الدین بلخی: حیات و آثار'' میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ حضرت بلخی ''محض ایک محقق نہیں بلکہ اپنے کارناموں اور اپنے تحقیقی تربیت کے مزاج کی بدولت محقق گر کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔'' آج تو جدید تکنیک کے طفیل ریسرچ اسکالروں کے لئے ہزاروں سہولتیں مہیا ہیں، البتہ حیرت ہوتی ہے حضرت بلخی اور ان کے معاصر بزرگوں کی خدمات پر کہ آج سے ستر، اسی برس پہلے کے دور میں انہوں نے کیسی محنت سے کیسے کیسے یادگار کارنامے انجام دئے اور آنے والی نسلوں کے لئے کیسی کیسی نایاب کتابیں چھوڑ گئے۔ جناب ابوالبرکات شاذؔ قاسمی نے اپنے مقالہ ''واقفؔ عظیم آبادی: حیات وشاعری'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''علامہ واقفؔ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ آرٹ لکھتے تھے اور راکھ کھاتے تھے۔'' یہ بات صرف مشہور ہی نہیں بلکہ بالکل سچ ہے۔ آج بھی نہ جانے کتنے ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے انہیں راکھ پھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی زندگی کا آخری زمانہ واقعی بہت افسوسناک اور عبرت ناک گزرا۔ کہنے والوں نے مذہب کو افیون کہا ہے، ایسا ہو یا نہ ہو، بہرحال شاعری واقفؔ صاحب کے لئے افیون ہی ثابت ہوئی، البتہ یہ ضرور ہے کہ صاحب احتیاج ہوکر بھی انہوں نے اپنی اَنا سنبھالے رکھا۔ علامہ واقفؔ کی شہرت تو ان کی شاعری ہی سے ہے، لیکن ان کی تصویر کے ساتھ اُن کی تحریر کا جو عکس دیا گیا ہے، اس کے مضمون سے اور پھر ''اقوال واقفؔ'' کے مشمولہ فیلر سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے وقت کے اہم فکری نثار کہلانے کا بھی حق رکھتے ہیں اور یقیناً ان کے قلم میں ادبی تنقید وتجزیہ کی موثر قوت بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس شمارے کے اندرونی سرورق پر مظہر امام اور صدیق مجیبی کی مختصر سوانح کے ساتھ ان دونوں نامیان سخن کی جو غزلیں دی گئی ہیں، وہ زبان حال سے آپ کے شعور انتخاب اور حسن انتخاب کی گواہ ہیں۔ ''مقالات'' کے حصے میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین نے ''ساحرؔ کا منفرد شعری اسلوب'' واقعی بہ نظر عمیق تلاش کیا ہے اور پڑھنے والوں کے سامنے لادیا ہے۔ ''بہار کے اردو گو صوفی شعرا'' پر ڈاکٹر محمد ذاکر حسین کا مقالہ بھی کافی عمدہ و پسندیدہ ہے۔ جناب محمد شریف ریاضیؔ نے ''بدرؔ اورنگ آبادی کی تبصرہ نگاری'' پر اگر چہ بہت ہی مفید مطالعہ مواد مہیا کردیا ہے، مگر اُن سے دو باتوں کی شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے، ایک تو یہ کہ مضمون بالکل اچانک شروع ہوگیا ہے یا یوں کہیں کہ تمہید و تعارف کا التزام چھوٹ گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ ہزار برجستگی کے باوجود، بہرصورت یہ مضمون اقتباسات کی طوالت سے خاصا بوجھل بھی ہوگیا ہے۔ اس میں کیا شک کہ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے ''امالہ سے بے نیازی ایک بڑی غلطی'' کے عنوان پر قلم ہی نہیں اُٹھایا ہے بلکہ اسے مقصدی اور اصلاحی لحاظ سے مدلل اور موثر بنانے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ اس شمارے کے دونوں ہی ''افسانے'' یعنی ''رشتہ کاغذ کا'' (محترمہ شیریں نیازی) اور ''سیسہ پلائی دیوار'' (ڈاکٹر رفیعہ نوشین) بھی اچھے افسانے ہیں اور ''حرف آغاز'' میں اُن کے متعلق آپ کی رائے بھی نہایت متوازن ہے۔ ''گاہے گاہے......'' کے صفحات بھی یقیناً دستاویزی ہی کہلائیں گے۔ حضرت داغؔ پر تقریباً ایک سو بیس سال پرانا، چکبستؔ لکھنوی کا تعزیتی مضمون اور وہ بھی وقار عظیم کے چند حواشی سمیت، ایک ادبی تبرک ہی تو ہے۔ اس میں شاعری کے اعجاز پر گفتگو اور پھر چکبستؔ کی خوبصورت زبان، بہت دیر تک اپنی گرفت میں لئے رہی۔ افسوس! ڈاکٹر اشرف جہاں کا سایہ آج سے پانچ سال پہلے ہی اُٹھ چکا تھا اور اب ڈاکٹر قمر جہاں بھی رخصت

ہوگئیں۔ ''وفیات'' کے تعزیتی ورق پر مستزاد، آپ نے خراجِ عقیدت کے طور پر ان کا افسانہ ''فریج کی عورت'' اس شمارے میں شامل کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ ''منظومات'' کا حصہ بھی اس شمارے میں صنفی تنوع سے محروم نہیں، خصوصاً جناب شاہد اختر کے ''اردو بازار'' کا نقشہ بار بار سوچنے پر مجبور کرتا رہا کہ یہ محض فن کار کا ذاتی کرب وشکوہ تو نہیں ہوسکتا۔ یقیناً اس میں اجتماعی فکر واحساس کو جھنجھوڑنے والے پہلو بھی ہیں۔ ''کتابوں کی دنیا'' کے سبھی تبصرے معیاری اور متوازن ہیں، ڈاکٹر بانو سرتاج کے مجموعہ ''بے زمینی کا درد'' میں ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے ان کی کہانیوں کی روح تک قاری کو پہنچا دیا ہے۔ ڈاکٹر صابر علی سیوانی کی تحقیقی کتاب ''روضۃ الشہدا اور کربل کتھا: تقابلی مطالعہ'' پر ڈاکٹر محمد ارمان کا تبصرہ بھی نہایت عالمانہ وقیع وبسیط ہے۔ جناب اشفاق عادل ڈاکٹر بدر محمدی کی کتاب ''بعد از مطالعہ'' پر نظر ڈالتے ہوئے حق تبصرہ کی ادائیگی سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں اور محترمہ شبانہ عشرت نے ''آرادھنا پرساد'' کے شعری مجموعہ ''پھول چپ اور بولتی خوشبو'' کو پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے تبصرے کی فضاؤں میں پھیلا دیا ہے اور ان گوشوں کی طرف اشارے کردئے ہیں جہاں یہ خوشبو پہنچنے سے رہ گئی ہے یا اگر پہنچی بھی ہے تو دامن اردو کی ہوا لے کر نہیں پہنچ سکی ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' میں ڈاکٹر طاہر الدین طاہر کا مضمون ''سوال وجواب کی باتیں'' آج کے دور کے لحاظ سے بہت کارآمد مضمون ہے۔

(ڈاکٹر) نشاط، ویشالی

☆ ''زبان وادب'' ماہ مارچ ۲۰۲۵ء موصول ہوا۔ تین مضامین اور تین خوبصورت نظموں سے سجا سجایا ''بچوں کا زبان وادب'' بے حد پسند آیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر کہانیاں پڑھنے کو ملیں تو کیا خوب! اور اس بار کوئی کہانی اس حصہ میں پڑھنے کو نہیں ملی، مگر یہ کمی یا اس طرح کہیں کہ یہ شکایت مضامین پڑھنے کے بعد بڑی حد تک دور ہوگئی، اس لئے کہ سبھی مضامین اپنے اپنے موضوعات پر نئے نئے سے بھی ہیں اور معلومات بھی دے جاتے ہیں۔ مضامین کا سلسلہ ڈاکٹر طاہر الدین طاہر کے تربیتی تحفہ سے شروع ہوا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ''سوال وجواب کی باتیں'' بہت اچھے انداز سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مضمون ذرا لمبا ہے، مگر بہت اچھا ہے۔ اسے پڑھنے کے دوران کئی محاوروں اور کہاوتوں کے مطلب بھی سامنے آئے اور کئی اقوال بھی۔ اس مضمون میں سوال اور جواب کے تعلق سے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ''کیا کرنا چاہئے'' وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ''کیا نہیں کرنا چاہئے'' اور اسی لئے یہ مضمون خاص طور سے مجھے اور میرے دوستوں کو بہت اچھا لگا۔ ''ایک بھارت، شریشٹھ بھارت'' پروگرام کے بارے میں جناب شرف الہدیٰ کا مختصر سا مضمون بھی اچھا ہے اور ''فوٹوگرافی'' پر جناب نوازش خرم کا مضمون بھی تاریخی اور تکنیکی معلومات دے رہا ہے۔ ڈاکٹر رؤف خیر کی دونوں نظمیں اپنی اپنی جگہ آسان الفاظ اور آسان انداز میں پیاری پیاری سی نظمیں ہیں، خاص طور سے نظم ''تھرڈ امپائر'' اس لحاظ سے بہت ہی عمدہ ہے کہ اس میں اللہ سے ڈرتے رہنے کا ایک پیغام ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، یہ ہمیں بھولنا نہیں چاہئے۔ وطن کی محبت کے جذبوں سے سرشار جناب رونق خلیقی کی نظم ''......وطن پہ اپنے'' سچ مچ گنگناتی ہوئی نظم ہے، برا ہو، بڑھتی ہوئی ماحولیاتی آلودگی کا کہ ''گوریا'' ہمارے گھروں سے غائب ہورہی ہے۔ اس کی حفاظت ہونی چاہئے تا کہ اس کی نسل بچی رہے۔ اس معاملہ سے جناب امتیاز دانش کی نظم نے بہت متاثر کیا۔ زیادہ اگلے شمارے کا انتظار رکھتے ہوئے خدا حافظ!

محمد ایان، مظفر پور

☆ ماہنامہ ''زبان وادب'' ماہ جنوری ۲۰۲۵ء باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے کے تمام مشمولات اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ تاہم پروفیسر قدوس جاوید صاحب کا مضمون ''غلام سرور اور اردو تحریک'' اس شمارے کا حاصل ہے۔ اردو کے لئے شروع کی جانے والی اس تحریک سے وابستہ اور بھی بہت ساری ایسی باتیں تھیں جو غالباً طوالت کے خوف سے پروفیسر قدوس جاوید صاحب نے ضبط تحریر میں لانے سے گریز کیا۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے اور تحریک کو مزید تقویت پہنچانے کے مقصد سے مظفر پور کانفرنس کا بڑا ہی اہم رول رہا جس میں پٹنہ، دربھنگہ، مظفر پور، رانچی اور جمشید پور سے کثیر تعداد میں اہالیان

اردو نے شرکت کی تھی۔ اس تحریک سے ہماری بہت ساری یادیں وابستہ ہیں۔ جھارکھنڈ (سابقہ بہار) میں رانچی کا ایک سرد دن تھا۔ رانچی یونیورسٹی میں ایم۔اے کے امتحانات جاری تھے، خاکسار بھی بطور طالب علم ایم۔اے اردو کا امتحان دے رہا تھا۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر وہاب اشرفی اور پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب کی نگرانی میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ابھی تک آٹھ میں سے چھ پرچوں کا ہی امتحان پرسکون ماحول میں ہو پایا تھا کہ تب اچانک ایک دن بہار کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے قانون کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور اس کے اعلان کے ساتھ ہی ایسا لگا کہ پورا بہار ہل جائے گا۔ لسانی تعصب رکھنے والوں کو یہ فیصلہ گوارہ نہ تھا، پوری ریاست میں جگہ جگہ احتجاجی مظاہرے، پرتشدد توڑ پھوڑ اور آگ زنی کے واقعات پیش آئے۔ رانچی کے حالات کچھ زیادہ ہی دگرگوں ہوگئے۔ یونیورسیٹی کا شعبہ اردو آگ کی نذر ہوگیا اور اس لائبریری میں محفوظ اردو کی ہزاروں کتابیں جلادی گئیں، یہاں تک کہ اردو دشمنوں نے شہر کے مین روڈ پر واقع پٹاخوں کی ایک بڑی دوکان میں بھی آگ لگادی جس کے نتیجہ میں پورا شہر گھنٹوں دھماکوں سے گونجتا رہا۔ اپنے امتحان کے سلسلہ میں ہم پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب کے دولت کدہ میں مقیم تھے۔ عثمانی صاحب بلا کے سگریٹ نوش تھے، کرفیو کے نفاذ کو دو دن ہوگئے تھے، بغیر سگریٹ کے عثمانی صاحب کی کیا حالت ہوئی ہوگی وہ سگریٹ نوشی کرنے والے افراد بہتر محسوس کرسکتے ہیں۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کی تحریک میں ان کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے۔ ابوذر عثمانی، منظر کاظمی، شبیر احمد، قمر اعظم ہاشمی اور ظفر اوگانوی وغیرہ اس تحریک سے وابستہ تھے اور پروفیسر عبدالمغنی کے کڑی حمایتوں میں تھے۔ کچھ سیاسی اور صحافتی بنیادوں پر غلام سرور صاحب سے ان کا نرم وگرم اختلاف تھا۔ تیسرے دن ریڈیو پر اعلان ہوا کہ کرفیو میں ڈھیل دی گئی ہے، عثمانی صاحب بہت خوش ہوئے اور ہمیں بھی حکم دیا کہ چلو باہر سے سگریٹ لے کر آتے ہیں، ابھی دکان تک پہنچا بھی نہ تھا کہ مخالف سمت سے اسلحہ بردار پولس فورس کی پوری ٹیم نے ہم دونوں کو آگھیرا اور سختی کے ساتھ رائفل چمکاتے ہوئے گھر کے اندر چلے جانے کا حکم صادر کیا اور سگریٹ کے عدم حصول کی مایوسی سمیٹے ہم دونوں واپس گھر میں داخل ہوگئے۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ بہت آسانی سے حاصل نہیں ہوا۔ بہت سارے کرم فرماؤں کی اس میں جدوجہد شامل ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے مضمون ''غلام سرور اور اردو تحریک'' کے تحت اپنی یادداشت اور اپنے مشاہدات کی بنیاد پر جو کچھ تاریخی حوالوں سے لکھا ہے اُسے ریکارڈ کے طور پر محفوظ رکھا جانا چاہئے۔ اردو کو لے کر ابھی ہنگامہ تھما نہیں تھا۔ کرفیو کے بعد چوتھے دن سرکاری طور پر پولیس انتظامیہ نے بذریعہ مائک پورے شہر میں اعلان کیا کہ رانچی شہر میں باہر کے جتنے بھی طلبا وطالبات ہوں، وہ دو گھنٹے کے اندر شہر چھوڑ دیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہم ابوذر عثمانی صاحب کے دولت کدہ سے پیدل چل کر کانٹا ٹولی چوک پہنچے۔ ایک بس کی مساغت اختیار کی اور جمشید پور آگئے، پھر کئی ماہ بعد جب ریاست بہار اور رانچی کے حالات نارمل ہوئے اور ماحول قدرے پرسکون ہوا تو باقی ماندہ دو پرچوں کے امتحان ہوئے۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کی خبر، وزیراعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی حوصلہ مندی، اردو مخالفین کے پرتشدد مظاہرے اور توڑ پھوڑ کی خبریں کئی دنوں تک ہندی اور اردو کے اخباروں میں سرخیاں بٹورتی رہیں۔ احتجاج بھی جاری رہا، لیکن سرکاری انتباہ کے سامنے آخرکار اردو مخالفین نے گھٹنے ٹیک دیئے۔

اختر کاظمی، پونے

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا
زبان وادب

☆	مچھروں کی ہڈیاں	ڈاکٹر بانو سرتاج	۷۴
☆	بابائے ہومیو پیتھ	غلام محمد	۷۶
☆	بھولی بھالی تتلی	انور آفاقی	۷۷
☆	تقدیر کا کھیل	صبا پروین	۷۸
☆	ہماری کائنات	عرشی فاطمہ (علیگ)	۷۹

ڈاکٹر بانو سرتاج
"Sartaj House" Jindran Nagar, Near 1st MSEB Tower, Pandharkawada Road, Yavatmal - 445001

مچھروں کی ہڈیاں

بہت پرانے زمانے کی کہانی ہے، اُس زمانے کی، جب ہندوستان کے سوداگر دوسرے ملکوں میں جا کر تجارت کرتے تھے، سفر سڑک کے ذریعہ نہیں سمندر کے راستے ہوتا تھا اور تیسری خاص بات یہ تھی کہ خرید وفروخت سکوں سے نہیں بلکہ مال کے بدلے مال کے طریقے سے ہوتی تھی۔

ہندوستان کے جنوبی علاقہ کا ایک تاجر زری کے قیمتی کپڑوں سے بھرا جہاز لے کر تجارت کے لئے نکلا۔ مختلف جزیروں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک گھنی آبادی والے جزیرے کو اُس نے پسند کیا۔ جہاز کو سمندر میں کھڑا کر کے ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔

اُسے یہ قطعی پتہ نہیں تھا کہ عرف عام میں وہ جزیرہ ''ٹھگوں کا جزیرہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ٹھگ کسی مالدار تاجر کو تاک لیتے، پھر ٹولیاں بنا کر اُسے گھیرتے۔ مال کی بولیاں لگاتے، بولیوں کی رقم کم کرتے جاتے اور پھر کم سے کم قیمت میں خرید کر بدلے میں گھٹیا مال پکڑا دیتے۔

رات کے گزرتے ہی دو ٹھگ بیوپاری بن کر سرائے میں پہنچ گئے۔ تاجر سے اُس کے مال کی تفصیلات حاصل کیں، پھر اپنے مال کے بارے میں بتایا۔ تاجر نے کہا:

''میرا جہاز وہاں کھڑا ہے، آپ بھی اپنا جہاز وہاں لگا لیجئے۔ میں مال دیکھ لوں تو بات آگے بڑھے گی۔''

ٹھگوں نے اپنا جہاز جو سامان سے لدا تھا، کنارے منگوا لیا۔ انہوں نے بتایا کہ ڈبوں میں ناریل اور گرم مسالے ہیں۔ چند ڈبے کھول کر بھی دکھائے۔

سودا طے ہو گیا۔ ٹھگوں نے خوشی سے نعرے بلند کئے:

''سودا پکا......سودا پکا......''

رقم ادا کی اور جلدی جلدی جہاز اپنے علاقہ کی طرف روانہ کر دیا۔

ٹھگ چلے گئے تو وہ جہاز پر چڑھا اور بوروں اور ڈبوں میں رکھے ہوئے سامان کو جانچنے لگا۔ تب اُسے پتہ چلا کہ بوروں میں ناریل اور گرم مسالے نہیں، جانوروں کی ہڈیاں بھری ہوئی ہیں۔

اُس نے سر پکڑ لیا۔ علاقہ اُس کے لئے نیا تھا، جہاں اُس کی جان پہچان کا کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ پریشان حال سرائے میں پہنچا۔ سرائے کے ملازمین مالکن کو تمام واقعہ بتا چکے تھے۔ وہ تاجر کے پاس پہنچ کر بولی:

''سر پکڑ کر بیٹھنے سے کچھ نہ ہوگا۔ فوراً مکھیا کو خبر کرو۔ دیر کرو گے تو ٹھگ جہاز دور لے جا کر پورا سامان بدل دیں گے۔ چل کر رپورٹ لکھاؤ۔ میں تمہاری طرف سے گواہی دوں گی۔''

تاجر کو لے کر مالکن مکھیا کے پاس پہنچی۔ رپورٹ درج کرا دی۔ مکھیا نے دونوں طرف کے لوگوں کو دوسرے دن آنے کو کہا۔

بڑھیا مالکن نے تاجر کو کھانا کھلایا اور سمجھاتے ہوئے بولی:

''ابھی ناسمجھ ہو۔ سفر پر جاتے وقت کسی بھی انجان شخص پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ دیکھ پرکھ کر دوست بنانا چاہئے۔ سوچ سمجھ کر سودا کرنا چاہئے۔ کم سے کم مجھ سے تو مشورہ کرنا چاہئے تھا۔''

تاجر کا منہ اُتر گیا تو مالکن نے کہا: ''اب رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جیسا کہتی ہوں، ویسا کرو تو مال واپس مل جائے گا۔''

دوسرے دن مکھیا کے سامنے، تاجر اور دونوں ٹھگ پیش ہوئے۔ مکھیا نے ٹھگوں سے کہا:

''تم نے دوسرے علاقہ کے تاجر کے زری کے کپڑوں سے بھرے جہاز کے بدلے ہڈیوں سے بھرا جہاز پکڑا دیا، کیوں......؟''

ایک ٹھگ نے کہا: ''ہڈیوں سے بھرے جہاز پر ہی سودا طے ہوا تھا۔انہوں نے ہڈیاں مانگیں، ہم نے مہیا کرادیں۔''

مکھیا نے تاجر سے پوچھا: ''کیا یہ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''جی ہاں، سچ کہہ رہے ہیں۔''

تاجر نے کہا تو ٹھگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

مکھیا نے کہا:

''اگر یہ صحیح کہہ رہے ہیں تو تم عدالت میں کیوں آئے......؟''

''سودا ہڈیوں ہی کا ہوا تھا، مگر ہم نے جس طرح کی ہڈیاں مانگی تھیں اس کی بجائے انہوں نے جانوروں کی ہڈیاں پکڑا دیں۔''

''تمہیں کون سی ہڈیاں سونپی گئیں؟''

''جنگلی جانوروں کی۔''

''تم نے مانگی کون سی تھی؟''

''مچھروں کی ہڈیاں مانگی تھیں۔'' تاجر نے اطمینان سے کہا

''یہ جھوٹ ہے...... یہ جھوٹ ہے...... بات صرف ہڈیوں کی ہوئی تھی۔'' ٹھگ چلائے:

''بات مچھروں کی ہڈیوں کی ہوئی تھی مکھیا جی۔ میں بہت دور سے آپ کے جزیرے میں آیا ہوں۔میری دادرسی کیجئے۔''

''تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟'' مکھیا نے پوچھا:

''میرا بھائی میرا گواہ ہے۔ اسی کے سامنے بات ہوئی تھی۔'' بڑے ٹھگ نے کہا:

''بھائی کی گواہی قبول نہیں کی جاتی۔''

مکھیا نے کہا اور تاجر سے پوچھا:

''تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟''

تاجر نے سوچتے ہوئے کہا:

''جب ہم سودا کر رہے تھے سرائے کی مالکن وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے ضرور ہماری باتیں سنی تھیں۔'' ایک آدمی کو سرائے بھیجا گیا۔ وہ مالکن کو ساتھ لے آیا۔مکھیا نے پوچھا:

''اماں! کیا آپ ان دونوں کے درمیان ہوئے سودے کے بارے میں جانتی ہیں؟''

''ہاں جانتی ہوں۔سودا میرے سامنے ہی ہوا تھا میں کمرے میں بستر کی چادریں بدل رہی تھی۔''

''کس قسم کے مال پر سودا ہوا تھا؟''

''اجنبی تاجر کو مچھروں کی ہڈیاں درکار تھیں۔''

سرائے کی مالکن نے کہا:

''کس کی ہڈیوں کا؟''

مکھیا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''مچھروں کی ہڈیوں کا۔'' مالکن نے اعتماد سے کہا ''مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ مچھروں کی ہڈیاں کس کام آئیں گی، مگر میں نے پوچھا نہیں، مجھے ضرورت ہی کیا تھی؟''

مکھیا نے سرائے کی مالکن کی گواہی قبول کر لی۔ٹھگوں کو تاجر کا مال بھرا جہاز لوٹانا پڑا۔ساتھ ہی جرمانہ بھی دینا پڑا۔مکھیا نے وہ رقم تاجر ہی کو دے دی اور سرائے کی مالکن کی عقل مندی کی تعریف کی۔ ❁❁

حسد: نیکیوں کا دشمن

پیارے بچو! نیکیوں کے ایک بڑے دشمن کا نام حسد ہے۔اللہ نے اپنی کتاب میں حسد کرنے والوں کی برائی سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔حسد یہ ہے کہ جب اللہ کسی کو کوئی نعمت دے تو حاسد یہ کہے کہ وہ نعمت اُس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔حسد کرنے والے کی مثال اُس شخص کے جیسی ہے جو اپنے دشمن کو مارنے کے لئے پتھر پھینکے اور وہ پتھر دشمن کو لگنے کی بجائے اُس کی اپنی آنکھ میں لگ جائے اور آنکھ پھوٹ جائے، پھر غصہ میں آکر وہ زور سے پتھر پھینکے اور وہ پتھر واپس آکر اُس کی دوسری آنکھ پھوڑ دے اور تب انتہائی غصہ میں کچ کچا کر وہ تیسرا پتھر پھینکے اور اپنا ہی سر پھوڑ لے اور اس طرح غصہ میں پاگل ہو کر اپنے آپ کو زخمی کرتا جائے۔حسد سے بچو کہ آسمان پر سب سے پہلی نافرمانی اسی گناہ کے سبب ہوئی تھی اور زمین پر پہلا گناہ بھی حسد ہی کے باعث ہوا۔رسول پاک کا ارشاد ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔(ماخوذ)

غلام محمد
Alamganj, Patna - 800007

بابائے ہومیو پیتھ

علامات کا علاج، ہم علامات کے ذریعہ ـــــــ یہ قول ہے بابائے ہومیو پیتھ کا جنہیں دنیا ڈاکٹر ہانیمن (Dr. Hahnemann) کے نام سے جانتی ہے۔ان کا پورا نام سیموئیل کرسچن فراڈرک ہانیمن تھا۔

سیموئیل ہانیمن کی پیدائش ۱۰/اپریل ۱۷۵۵ء کو جرمنی کے صوبہ سکنی میں ہوئی۔ان کے والد کا نام کرسچن گویفرڈ ہانیمن اور والدہ کا نام جوہانہ کرسچیانہ تھا۔ان کے والد ایک غریب آدمی تھے جو ایک کارخانہ میں چینی مٹی کے برتنوں پر نقاشی کا کام کیا کرتے تھے۔یہ ان کا خاندانی پیشہ تھا۔جب ہانیمن پانچ سال کے ہوئے، تب وہ اسکول جانے لگے اور دن رات کتابوں کے مطالعہ میں غرق رہنے لگے، لیکن ان کے والد چاہتے تھے کہ ہانیمن ان کے کام میں ہاتھ بٹائے۔یہ سوچ کر انہوں نے ہانیمن کا اسکول جانا بند کرا دیا۔

ایک روز ہانیمن کے استاد ماسٹر ملر، ہانیمن کے والد سے ملے اور ہانیمن کے اسکول نہ جانے کی وجہ پوچھی۔گوئفرڈ نے جواب دیا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔میرے اکیلے کی مزدوری سے بال بچوں کا پیٹ نہیں پلتا، اس لئے ہانیمن کو روک رکھا ہے۔ماسٹر ملر نے کہا آپ خوش قسمت ہیں۔آپ کو معلوم نہیں کہ یہ لڑکا خدا کے فضل و کرم سے کتنا ہونہار ہے۔ایک دن اس کا نام چاند سورج کی طرح چمکے گا۔اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کے تمام اخراجات کا ذمہ لیتا ہوں۔اس پر گوئفرڈ رضامند ہو گئے۔

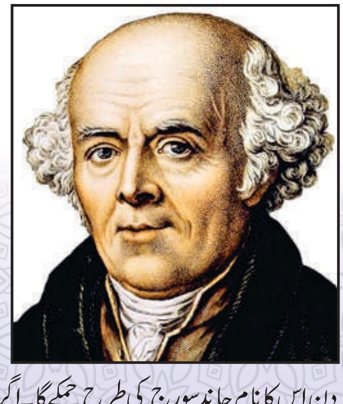

ہانیمن باقاعدہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔اسکول کی ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مطالعہ کا شوق بڑھتا گیا، رفتہ رفتہ ان کا رجحان علم طب کی طرف بڑھنے لگا۔والد غربت کی وجہ سے ان کے اخراجات اٹھانے سے مجبور تھے، اس لئے ان کے ایک دوسرے بڑے استاد نے لیپزک طبی کالج کے پرنسپل کے پاس سفارش بھیج کر ان کے سارے اخراجات معاف کرا دئے اور وہاں داخلہ کرا دیا۔اس کے بعد ہانیمن نے کئی دوسرے طبی کالجوں میں بھی تعلیم حاصل کی۔

جرمنی زبان تو ہانیمن کی مادری زبان تھی، اس کے علاوہ ان کو انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، یونانی، اٹالین وغیرہ دس زبانوں پر اچھی طرح عبور حاصل تھا۔

یکم/دسمبر ۱۷۸۶ء کو جب ہانیمن کی شادی ہوئی، اس وقت ہانیمن ایلو پیتھ ڈاکٹر بن چکے تھے، اس لئے انہوں نے پریکٹس شروع کر دی۔تھوڑے ہی دنوں میں انہیں بہت شہرت ملی، لیکن ان کو یہ طریقہ علاج پسند نہیں آیا۔وہ اس طریقہ علاج کو قانون قدرت کے خلاف کہتے تھے، لہٰذا انہوں نے ایلو پیتھ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا اور ایک ایسے طریقہ علاج کی تلاش میں لگ گئے جو قانون قدرت کے موافق ہو اور بیماروں کو تندرست کرنے کا صحیح طریقہ علاج ہو۔

ایلوپیتھی سے کنارہ کشی کے بعد وہ گیارہ سال تک وہ ''علاج بالمثل'' کی تلاش میں لگے رہے۔اس درمیان ہانیمن بے شمار جڑی بوٹی، زہریلی اشیا، دھات اور کائنات میں پائی جانے والی بے شمار چیزوں کی خاصیت کا تجربہ اپنے اوپر، اپنے بال بچوں کے اور دوستوں کے اوپر کرتے رہے۔یہ وہ دور تھا جب مادوں کی کیمیائی ساخت کے بارے میں بہت محدود علم تھا۔

۱۸۰۶ء میں ہانیمن نے اپنے زمانہ کے معتبر طبی رسالہ ''ہوف لینڈ جرنل'' میں پہلی بار ہومیوپیتھی طریقہ علاج کو واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔اس کے بعد ایلو پیتھ معالجوں نے ہانیمن کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔پروپگنڈہ اور مقدمہ بھی شروع کر دیا۔بالآخر ہانیمن کو ہمبرگ میں جا کر پناہ لینا پڑا، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا۔

ہومیو پیتھ (Homeopathy) دو لفظ کا مرکب ہے۔جس کا مطلب ہے ''قانون بالمثل'' چونکہ ہومیوپیتھی کا بنیادی اصول ''علاج بالمثل'' ہے اس لئے اُسے یہ نام ملا ہے۔ علاج بالمثال کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دوا کسی صحت مند انسان کو کھلانے کے بعد جو اثرات ظاہر ہوں، اگر ویسے ہی اثرات قدرتی طور پر کسی انسان میں دیکھے جائیں تو وہی دوا اس مریض کی شفایابی کا ذریعہ ہوگی۔

ڈاکٹر ہانیمن نے اپنے خیال کو آزمانے کے لئے سب سے پہلے ''سنکونا'' نامی دوا کا استعمال کیا۔سنکونا ایک پودے کا چھلکا ہے جو انڈیز اور ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔سنکونا استعمال کرنے کے بعد ہانیمن کو جاڑا بخار، گھبراہٹ، بے چینی اور شدید پیاس کی علامت شروع ہوئی جو تھوڑی دیر بعد خود بخود ختم ہوگئی۔اتفاق سے ڈاکٹر ہانیمن کو ایک ایسے مریض کو دیکھنے کا موقع ملا جو قدرتی طور پر ان ہی علامات کا شکار ہوگیا تھا۔ڈاکٹر ہانیمن نے یہی سنکونا اس مریض کو قلیل مقدار میں کھلا دیا۔ چند ہی گھنٹے میں اس آدمی کے اندر سے وہ ساری علامتیں ختم ہوگئیں۔

اسی طرح زکام کے شدید حملے میں ڈاکٹر ہانیمن نے پیاز کا عرق بطور دوا استعمال کیا۔ چونکہ پیاز سے اٹھنے والی جھانس سے بھی آنکھ اور ناک سے پانی گرنے لگتا ہے۔انہوں نے پیاز کے عرق سے تیار کی ہوئی دوا سے زکام کے مریضوں کا علاج کیا تو زکام دور ہوگیا۔

مخلوق خدا کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے ڈاکٹر ہانیمن اپنے مریضوں سے کہا کرتے تھے کہ ''میں تو صرف دوا دینے والا ہوں۔ شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔'' طبی دنیا میں ہومیوپیتھی طریقہ علاج کے موجد اور انسانوں کی بھلائی کے لئے انقلاب عظیم پیدا کرنے والے ڈاکٹر سیموئیل کرسچین فراڈرک ۲؍جولائی ۱۸۴۳ء بروز اتوار فرانس کی راجدھانی پیرس میں مخلوق خدا کو ہومیوپیتھی طریقہ علاج کا تحفہ دے کر اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ ❀❀

انورآفاقی

Hoda Manzil, Raj Toli (Bhigo),
P.o. Lalbagh, Darbhanga-846004

کتنی ہے بھولی بھالی تتلی
رب کی قدرت کی ہے نشانی
بچوں کا دل بہلانے کو
بھوک مٹانے ہی کی خاطر
جب بھی بچہ پکڑتا اس کو
سارا دن رہتی ہے اُڑتی
رنگ برنگے پنکھ سے اپنے
پولی نیشن کا ہے ذریعہ
دن بھر محنت رات کو سونا

ہر اک پھول پہ بیٹھتی تتلی
نیلی ، پیلی ، کالی تتلی
اللہ نے ہے بنائی تتلی
پھول کا رَس ہے پیتی تتلی
انگلی سے ہے پھسلتی تتلی
شام کو گھر ہے جاتی تتلی
سب کے من کو موہتی تتلی
قدرت کی یہ پیاری تتلی
درس ہے سب کو دیتی تتلی

انوؔر بھی خوش ہوجاتا ہے
دیکھ کے بچو ، پیاری تتلی

❀❀❀

صبا پروین
Sultanganj, Patna - 800006

تقدیر کا کھیل

کسی گاؤں میں ایک نہایت غریب آدمی رہتا تھا جس کا نام راشد تھا۔ وہ رسیاں بیچ کر اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ ایک دن اس کی دکان پر ایک تاجر آیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی تھا۔ راشد ان کو رسیاں دکھانے لگا۔

تاجر نے اپنے دوست سے کہا کہ میں نے بہت سارے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ دنیا میں اس لئے ترقی کرتے ہیں کہ ان پہ قسمت اچانک مہربان ہو جاتی ہے، جیسے تم اسی آدمی کو دیکھ لو اگر کہیں سے کوئی رقم اس کے پاس آ جائے تو اس کا کاروبار چل نکلے گا اور یہ خود ہی رسیاں بنانے کے بجائے ملازموں سے کام کرائے گا۔

راشد ان دونوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا، فوراً بولا:

''آپ درست کہہ رہے ہیں، لیکن میرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟''

''دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ تم بتاؤ کہ کتنی رقم سے اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہو؟''

''مجھ جیسے غریب کے لئے تو تیس اشرفیاں ہی کافی ہوں گی۔''

تاجر نے اسے اسی وقت تیس اشرفیاں دیں اور کہا کہ اپنا کام شروع کرو، دیکھتے ہیں تمہاری قسمت کہاں تک ساتھ دیتی ہے، پھر وہ دونوں تاجر چلے گئے۔ راشد نے ان اشرفیوں کو حیرانی سے دیکھا اور گھر جا کر انہیں ایک مٹکے میں چھپا کر رکھ دیا۔

دوسرے دن اس نے مٹکا غائب پایا تو فوراً بیوی سے پوچھا:

''مٹکا کہاں ہے؟''

''میں نے اس کو دے کر چوڑیاں خرید لیں۔''

''بیوقوف عورت اس مٹکے میں تیس اشرفیاں تھیں۔ فوراً جا کر اس دکاندار سے مانگ لاؤ۔''

وہ فوراً دوکاندار کے پاس پہنچی۔ معلوم ہوا کہ اس نے مٹکے کو کباڑ کی دکان پر بیچ دیا ہے اور تب یہ جان کر راشد اپنا سر پیٹتا رہ گیا۔

کچھ دنوں بعد وہ دونوں تاجر ایک بار پھر اس کی دکان پر آئے۔ دوکان اُسی پرانے حال میں تھی۔ انہوں نے راشد سے سارا ماجرا سنا اور پھر کہنے لگے:

''کوئی بات نہیں، یہ تیس اشرفیاں لو اور اس مرتبہ دیکھتے ہیں کہ تمہاری قسمت کہاں تک ساتھ دیتی ہے۔''

اس مرتبہ راشد نے اپنی بیوی کو بتا دیا اور اشرفیاں اپنے بستر کے سرہانے رکھ کر سو گیا۔

اس کے بستر کے قریب ہی دیوار میں چوہوں کا ایک بڑا بل تھا۔ رات بھر میں چوہے وہ اشرفیاں بل میں لے جا چکے تھے۔ اب پھر بیچارہ راشد وہیں کا وہیں تھا۔ ایک دو ہفتے بعد وہ دونوں تاجر اس سے پھر ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس کی دکان کا حال پہلے جیسا ہی ہے۔ انہوں نے راشد سے دریافت کیا اور اس نے ایک ہی سانس میں سارا ماجرا سنا دیا۔

تاجر کے دوست نے راشد سے کہا کہ آج تو ہمارے پاس اشرفیاں نہیں ہیں، لیکن ایک لوہے کا ٹکڑا ہے، اسے رکھ لو، شاید یہ تمہارے کوئی کام آئے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں چل دیے۔

راشد نے گھر آ کر لوہے کا وہ ٹکڑا ایک کونے میں پھینک دیا اور اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگا۔

ایک روز آدھی رات کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ پڑوس کے مچھیرے کی بیوی کھڑی تھی، کہنے لگی:

''میرا شوہر مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال تیار کر رہا ہے۔ کل صبح اس کو مچھلیاں پکڑنے جانا ہے، مگر ہمارے پاس جال کے ساتھ لٹکانے کے لئے کوئی وزنی چیز نہیں ہے، کیا کوئی بھاری چیز یہاں ہوگی؟''

راشد نے فوراً اس عورت کو لوہے کا وہ ٹکڑا دے دیا۔

اگلے روز مچھیرے نے جال ڈالا اور ہزاروں مچھلیاں پکڑیں اور پھر سب سے بڑی مچھلی دے کر اپنی بیوی کو راشد کے گھر بھیجا۔

(بقیہ ص ۸۰ پر)

عرشی فاطمہ (علیگ)
"Yusuf Colony" Darzitola Gali, Patna - 800004

ہماری کائنات

عزیز بچو......! کیا کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہماری یہ کائنات کتنی پرانی ہے، یہ کیسے بنی اور آسمان میں ٹمٹماتے ہوئے یہ تارے ہم سے کتنی دوری پر ہیں؟

سائنسدانوں کا ماننا ہے کہ کائنات 13.8 ارب سال پرانی ہے۔ ''بگ بینگ تھیوری'' (Big Bang Theory) کے حساب سے ایک تل سی چھوٹی جگہ میں تمام مادہ سمٹا ہوا تھا جس میں دباؤ اور گرمی کی وجہ سے ایسا دھما کہ ہوا کہ اس کے ذرّات دور دور پھیل گئے، پھر کم کثافت سے درجہ حرارت میں گراوٹ آ گئی اور پوری جگہ ٹھنڈی ہوگئی۔ اسی دوران ہائڈروجن (Hydrogen) اور ہیلیم (Helium) جیسی گیسیں بھی بنیں، پھر قوت کشش کے زور سے ذرّات نے آپس میں مل کر خلا میں طرح طرح کی شکلیں اختیار کرلیں جنھیں ہم تارے، سیارے وغیرہ کہتے ہیں۔

کیا تارے کبھی ختم ہوتے ہیں؟ جی ہاں! لاکھوں ارب سال گزرنے پر دباؤ اور گرمی کی وجہ سے تارے بھی ایک دن پھٹ کر کائنات میں فنا ہوجاتے ہیں جسے ہم ''سپر نووا'' (Supernova) کے نام سے جانتے ہیں۔ خلا میں کچھ ایسی خطرناک چیزیں بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی تارہ یا سیارہ گیا تو پھر وہ وہاں سے کبھی باہر نہیں آ سکتا، کیوں کہ وہاں قوتِ کشش اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ روشنی تک اسے پار نہیں کرسکتی، اس چیز کا نام ''بلیک ہول'' (Black hole) ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ کسی چیز کی رفتار اسے پار کرنے کے لئے روشنی کے رفتار (>3x10^8metre) سے زیادہ ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی بلیک ہول کے بارے میں زیادہ جانکاری اکٹھا نہیں ہو پا رہی ہے۔

تاروں اور سیاروں کے مجموعہ کو کہکشاں (Galaxy) کہتے ہیں۔ ایک ایسی ہی کہکشاں ''ملکی وے'' (Milky Way) ہے جس میں ہماری زمین اور سورج ہے۔ یہ اتنی بڑی ہے کہ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں ہمیں ایک لاکھ نوری سال (ایک نوری سال=10^15 میٹر) لگیں گے۔ کچھ اور کہکشاں کی کھوج کی جا چکی ہے جن کے نام ہیں ''اینڈریموڈا گلیکسی'' (Andremoda Galaxy)، ''ٹرائی اینگولر گلیکسی'' (Triangular Galaxy)، ''ورلپولی گلیکسی'' (Whirlpool Galaxy) وغیرہ۔ ان میں سے ''اینڈریموڈا گلیکسی'' (Andremoda Galaxy) جو ملکی وے سے قریب 25 لاکھ نوری سال دور ہے، نسبتاً سب سے نزدیک مانی جاتی ہے۔ کائنات میں ایسی لاکھوں کہکشائیں ہیں جس کی کھوج ابھی جاری ہے۔

آکاش گنگا میں بہت سارے تارے ہیں، جن میں زمین سے سب سے نزدیکی تارا سورج ہے۔ جی ہاں! سورج ایک تارہ ہی ہے۔ البتہ وہ ہمیں باقی تاروں جیسا ٹمٹماتا ہوا نہیں نظر آتا، کیوں کہ وہ زمین سے باقی تاروں کی بہ نسبت نزدیک ہے۔ زمین سے سورج کی دوری تقریباً 10^11 میٹر ہے۔ اس کے بعد نزدیکی تارہ ''پروکسیما سنٹوری'' (Proxima Centauri) ہے جس کی زمین سے دوری چار نوری سال ہے۔

تارے اصل میں سورج کی طرح روشنی اور گرمی کے ذرائع ہیں، وہ تو بس ان کی روشنی جو زمین پر پڑتی ہے اس کے ریفریکشن (Refraction) کی وجہ سے ہمیں ٹمٹماتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم، آسمان میں جو تارے اپنی کھلی آنکھوں سے بغیر کسی دوربین کے دیکھتے ہیں، وہ سب ملکی وے میں ہی ہیں۔ کبھی آسمان میں یہ غور کیا ہے کہ کچھ خاص تاروں کو ملانے پر وہ عجیب وغریب نمونہ (pattern) بناتے ہیں؟ یہ پیٹرن تبھی مکمل بن سکتا، جب وہ سارے تارے صحیح طور سے نظر آ رہے ہوں۔ اس پیٹرن کو انگریزی میں کونسٹی لیشن (constellation) کہتے ہیں۔ کچھ شیر (Leo-thelion) کی طرح، کچھ چمچے کی طرح ursa (major and ursa minor) تو کچھ تاروں کو ملانے پر وہ ایک شکاری

(Orion) کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

کہکشاں ملکی وے

زمانہ قدیم میں یہ مانا جاتا تھا کہ سورج زمین کے اِردگرد گھومتا ہے، پھر سائنس کی ترقی سے ہمیں پتہ چلا کہ ہماری زمین اورباقی سیارے ایک متعین رفتار میں سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ''نظامِ شمسی'' (Solar System) انہیں سیاروں (Planet) خردسیاروں (Dwarf Planet)، ایسٹیرواِیڈ (Asteroid) چاند، سورج اور کومیٹس کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ زمین کے پاس ایک، مریخ کے پاس دو اور مشتری کے پاس ۹۵ چاند ہیں۔

ایک اور چونکانے والی بات یہ ہے کہ چاند کی خود کی کوئی روشنی نہیں ہوتی پھر وہ ہمیں اتنا چمکدار کیسے دکھائی دیتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ چاند پر جو سورج کی روشنی پڑتی ہے اس کے عکس (Reflection) کی وجہ سے وہ ہمیں چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ہماری زمین اوراس کے ساتھ سیارے

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ جب کائنات میں اتنے سارے سیارے ہیں تو صرف زمین پر ہی زندگی ممکن کیوں ہے؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہاں مختلف گیسیں موجود ہیں، جیسے آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، نائٹروجن (ایک طے تناسب میں) پانی، سورج کی روشنی (نہ زیادہ نہ کم) اور ایٹماس فیرک لیئر (Atmospheric Layer) (جو کہ ہمیں سورج کی نقصاندہ روشنیوں سے بچاتا ہے) یہ سب چیزیں ایک ساتھ اور کسی سیارے پر اب تک نہیں مل پائی ہیں، البتہ سائنسدانوں کی کھوج جاری ہے۔ ❁❁

تقدیر کا کھیل (ص ۷۸ سے آگے)

راشد کی بیوی نے مچھلی کے جب ٹکرے کیے تو اس کے پیٹ میں سے ایک چمکدار پتھر نکلا۔ پتھر اتنا زیادہ چمکدار تھا کہ راشد کو رات کے وقت اپنے گھر میں دیا جلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

اگلے روز ان کے گھر ایک تاجر کی بیوی آئی اور پوچھنے لگی:

''رات تمہارے گھر میں روشنی کیسی تھی؟''

راشد کی بیوی نے ساری بات بتادیا۔

''اگر مجھے وہ پتھر دے دو تو میں تمہیں دس اشرفیاں دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں 'ان' پوچھ کر کل بتاؤں گی۔''

دوسرے دن جب تاجر کی بیوی آئی تو اتفاقاً راشد بھی گھر میں موجود تھا۔ اس نے پتھر دینے سے انکار کیا، لیکن عورت ضد کرنے لگی۔ آخر تنگ آکر راشد نے کہا کہ اگر تمہارے پاس ہزار اشرفیاں ہیں تو دے دو اور یہ پتھر لے لو۔ عورت نے حامی بھر لی اور فوراً گھر جا کر ہزار اشرفیاں لے آئی اور وہ پتھر لے لیا۔

اب راشد کے پاس ہزار اشرفیاں ہوگئیں۔ ان اشرفیوں سے اس کا کاروبار دن بہ دن ترقی کرنے لگا۔

ایک دن وہی دونوں تاجر دوبارہ آئے تو راشد کی شاندار دکان اور اس کے ٹھاٹ بھاٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ راشد نے بتایا کہ تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں جو کام اشرفیاں نہ کرسکیں، وہ لوہے کے ایک بے کار سے ٹکڑے نے کر دکھایا۔ ❁❁

ادب کو عام فہم بنانے کی ضرورت

کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی اگر ساری نشانیاں مٹ جائیں اور صرف اس کا ادب بچا رہے تو اس قوم کی معاشرت کی تاریخ پھر سے مرتب ہوسکتی ہے......ایسے ادب کو جس میں عام قومی عادات و خصائل نہ جھلکیں، سچا ادب نہیں کہا جائے گا...... ادب کے ذریعہ سے عوام کے اندر شعور ذات پیدا کرنے کے لئے سخت جدو جہد کی ضرورت ہے اور میرے خیال کے مطابق اپنے ادب کو عام فہم بنانا پڑے گا یعنی اس کے معیار نفاست کو کچھ نیچا کر دینا ہوگا۔ (ہمارا ادب اور زمانے کے تقاضے)

ل-احمد اکبرآبادی

وحشت: ترقی پسندی کے امام

غالبؔ کو طرز بیدلؔ میں ریختہ کہنا قیامت نظر آیا تھا، مگر وحشتؔ نے طرز بیدلؔ کی تکمیل کردی......وحشتؔ کے کلام میں دوسری تمام خصوصیات اور شعری محاسن کے ساتھ فکر و خیال کا ترقی پسندانہ پہلو ملتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس وقت ان کی شاعری کا شباب تھا شعر و ادب کے باب میں ترقی پسندی کی اصطلاح وضع کرنے کا خیال بھی کسی دماغ میں نہیں آیا تھا۔ اس اعتبار سے وحشتؔ کو اگر اردو شعرا میں ترقی پسندی کا امام کہا جائے تو حق بجانب ہوگا۔ (کلام وحشتؔ کا ترقی پسندانہ پہلو)

ل-احمد اکبرآبادی کا اصل نام لطیف الدین احمد ہے، لیکن ادب و انشا کی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام سے ہی جانے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت ۸/اپریل ۱۸۸۵ء کو آگرہ میں ہوئی اور ۶/جون ۱۹۸۰ء میں آگرہ ہی میں ان کا انتقال بھی ہوا۔ ل-احمد ایک معزز اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے والد فتح محمد لکڑیوں کے مشہور اور بڑے تاجروں میں تھے، ان کی وفات کا سال ۱۸۹۳ء کے آس پاس ہے۔ اُس وقت ل-احمد محض آٹھ سال کے تھے اور اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ والد کی رحلت کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے انہیں اپنا خاندانی کاروبار سنبھالنا پڑا، لیکن اپنی ذہانت اور ذوق مطالعہ سے انہوں نے اپنی علمی قابلیت بڑھائی۔ ادبی دنیا میں وہ صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں۔ علاوہ ازیں مترجم، افسانہ نگار، مقالہ نگار اور تقریظ نگار کی حیثیت سے بھی اُن کی شناخت مستحکم ہے۔ ''لالہ رُخ'' اور ''فرشتوں کی محبت'' میں اگر انشائے لطیف کی بہاریں ملتی ہیں تو ''محبت کا افسانہ''، ''انشائے لطیف'' اور ''نغمات'' بھی اپنا خاص انفراد رکھتی ہیں۔ ل-احمد کے افسانوی مجموعے ''زندگی کے کھیل اور دن رات'' کے علاوہ ''صبح و شام'' اور ''نشیب و فراز'' بھی موجود ہیں اور ان کی کتاب ''ادبی تاثرات'' (۱۹۵۹ء) اور ''روسی فکر اور مفکر'' (۱۹۶۶ء) بھی اشاعت یافتہ ہے۔ ل-احمد کی زندگی کا بڑا حصہ کلکتہ میں گزرا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۴ء تک اور پھر ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۹ء تک وہ کلکتہ میں رہے۔ انہیں وہاں کی ادبی دنیا سے ۱۹۵۱ء میں حضرت جوشؔ نے متعارف کرایا تھا۔ وہ اگرچہ کم آمیز آدمی تھے، لیکن ''بزم احباب'' کے پروگرام میں شریک رہتے تھے۔ ل-احمد نظریاتی لحاظ سے ترقی پسند رجحانات کے حامی تھے۔ (مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب سے خصوصی اخذ و استفادہ)

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 46 | **April 2025** | **No. 04**

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کراکے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy,
on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press
Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

₹ 15/-